حضرت رئیس مرحوم

اور

فلاح دارین کا عروج

از قلم:

مولانا ایوب صاحب جمبوسری

26 شوال المکرم کا چاند روپوش ہونے کے عزم کے ساتھ طلوع ہوا، تو 10 جولائی کو افق پر آفتاب بدلیوں کی نورا کشتی کو درکنار کرتے ہوئے مدھم شعاؤں کے ساتھ طلوع ہوا، شاید آفتاب ومہتاب تاریکی کا اعلان کرنا چاہ رہے تھے اور واقعۃً تاریکی چھا گئی، یہ تاریکی ظاہری اور ابدانی نہیں تھی، بلکہ روحانی تھی۔ عالم اسلام کی ایک عظیم المرتبت شخصیت جو اپنی زندگی کے 85 سالہ طویل عرصۂ سفر کی تگ ودو سے تھک چکی تھی، جس کی مامتا کی چھاؤں میں اَن گنت ارواح راحت وسکون کی مستی بھری سانسیں لے کر کامیابی وکامرانی کی نغمہ سرائی میں مصروف تھیں، اس پر یکا یک مردنی چھانے لگی، اس کے خالق ومالک نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آخرت کے اس تھکے ہارے مسافر کو اپنی رحمت کے لازوال پلوں میں سمیٹ کر دائمی راحت وسکون کے اعجاز واکرام سے نوازا جائے۔

وہ عظیم المرتبت شخصیت جو علماء میں رئیسِ فلاحِ دارین، فخر ملتِ اسلامیہ، مفکر اسلام حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حضرت رئیس مرحوم صرف خوبیوں کے خوگر ہی نہیں، خوبیوں کے بھنڈار تھے، اپنے ماتحتوں کی چارہ گری کے لیے آپ کی ذات ایک کھلی کتاب تھی، آپ اکیلے اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، سبھوں کے لیے ایک شجرِ سایہ دار تھے، ماں کی مامتا کا پیاسا ہو یا پدرانہ شفقت کا متلاشی، محسن کے احسان کا جویا ہو یا مربی کی تربیت کا خواہاں، الغرض آپ ہر مرض کی دوا کے بے دام دوا فروش تھے۔ رئیس مرحوم ایک متبحر عالم دین تھے، دورانِ طالب علمی مستقل کوئی درسی کتاب مکمل پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، البتہ 13 سالہ دور میں جب بھی کسی استاذِ مکرم کی عدمِ موجودگی ہوتی، تو درسگاہ میں تشریف لے آتے یا اپنے دفتر میں جماعت کو بلا لیتے اور جو بھی کتاب ہوتی سبق سنتے، آپ کو چوں کہ عربی ادب سے کافی لگاؤ تھا اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اس لیے ہر کتاب میں ان کا عربی ذوق ابھر کر سامنے آتا، لیکن پھر بھی ہر فن کی باریکیوں سے طلبہ کو واقف کراتے اور ہر فن سے متعلق کتب کی معلومات فراہم فرماتے اور مطالعہ و تکرار پر ابھارتے، اچھی طرح ذہن سازی فرماتے اور یہی وہ موقع ہوتا کہ جس میں آپ طلبہ کی نفسیات سے واقف ہوتے: ذکی، ذہین، باذوق، صالح، نیک دل طلبہ یا غبی، کند ذہن، بے پرواہ، بے ذوق اور شرارتی طلبہ کو بھانپ لیتے۔ آپ کی حس اتنی تیز و طرار تھی کہ جس طالب علم کے بارے میں احوال و کیفیات کی جانکاری کے بعد کوئی رائے قائم کرتے وہی حقیقت بن کر سامنے آتی الا ماشاء اللہ۔

رئیس مرحوم اور عربی ادب:

عربی زبان اللہ کی زبان ہے، رسول کی زبان ہے، اسلام کی زبان ہے، عربی سے واقفیت کے بغیر اسلام کے مقتضیات کو سمجھنا کارے دارد، اسی لیے مدارس اور جامعات

اسلامیہ میں عربی زبان کے سیکھنے سمجھنے اور بولنے پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی سوانح میں یہ بات مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے بچپن ہی میں عربی زبان میں بلاتکلف تکلم پر مہارت حاصل کرلی تھی اور اس کا دور دور تک چرچا ہونے لگا تھا،ندوہ میں کسی بھی مقتدر شخصیت کی آمد ہوتی،تو اس بات کا چرچا ہوتا کے یہاں ایک نوجوان ہے، جو بلاتکلف عربی بول لیتا ہے، پھر حضرت کو ان کے سامنے پیش کردیا جاتا اور وہ آپ کی عربی بول چال پر عش عش کراٹھتے۔

ہمارے دور طالب علمی میں ایک طالبِ علم تھے: قاری ہارون سودانی،ان کی مادری زبان عربی تھی،حضرت مولانا ابرار صاحبؒ کی مجلس میں یا حوض پر وضو کرنے کے دوران حضرت رئیسؒ ان سے عربی میں بات چیت کرتے،تو بہت سے طلبہ تعجب سے ان کو دیکھتے رہتے۔ان سب باتوں کے ذکر کا حاصل یہ ہے کے ہمارے مدارس میں عربی زبان جس توجہ،محنت اور اہمیت کی حقدار تھی،اُس توجہ اور محنت سے محروم تھی،ہمارے مدارس میں عربی زبان کی اٹھان حضرت رئیس مرحوم کی مرہون منت ہے۔

فلاح دارین میں جب حضرت مولانا اقبال صاحب دامت برکاتہم کی آمد ہوئی،جو حضرت رئیس ہی کے پروردہ اور آپ کی آرزوؤں کے امین تھے،آپ کی آمد سے پہلے فلاح دارین میں عربی زبان کا اتنا شور وغلغلہ نہیں تھا(جیسے ہی حضرت مولانا اقبال صاحب کی فلاح دارین میں آمد ہوئی) گویا حضرت رئیس مرحوم کے ہاتھ ایک گوہرِ نایاب لگ گیا۔ویسے حضرت مولانا اقبال صاحب کی آمد سے پہلے حضرت رئیس مرحوم نے عربی زبان کی ہمواری کے لیے بساط بچھانی شروع کردی تھی،گجرات کے مدارس میں اردو انجمن کا قیام ایک بڑی بات سمجھی جاتی تھی،مدارس ابھی عربی انجمن کے قیام سے نا آشنا تھے،حضرت رئیس مرحوم

پہلے وہ مردِ مجاہد تھے جنہوں نے فلاح دارین میں "النادی العربی" کی داغ بیل ڈالی، لیکن ابھی اس کا ثمر آور ہونا ایک دور کی کوڑی کو حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ جب سن 1978 میں ہمارہ داخلہ ہوا، اس وقت انجمنِ اصلاح الکلام کا طوطی بول رہا تھا اور "النادی العربی" مسکنت کی حالت میں تھی، جمعرات مغرب کی نماز کے بعد جہاں دارالعلوم کی بالائی منزل کی ساری درس گاہیں اردو انجمن سے آباد ہوتیں، وہیں "النادی العربی" نیچے کی درس گاہ کے ایک کونے میں نا مانوسیت کا رونا روتی، اس لیے کہ ابھی نوشتۂ تقدیر کا فیصلہ یہی تھا، پس فلاح دارین میں جواں سال علماء کا تقرر عمل میں آنا شروع ہوا، ایک طرف ندوہ سے حضرت مولانا ایوب صاحب کوساڑی کی آمد ہوئی، تو دوسری طرف فلاحی خواب کی حسین تعبیر حضرت مولانا یوسف صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم کی تقرری عمل میں آئی، ایک طرف حضرت مولانا محمد عمرواڑی نے دستک دی، تو دوسری طرف حضرت مولانا اسلم صاحب موسالی دامت برکاتہم نے قدم رنجائی فرمائی، ان سب کی جاں فشانی نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم میں جان ڈال دی۔

دراصل ہمارے اساتذہ میں سے تین اساتذہ مدینہ منورہ اور ریاض تشریف لے گئے تھے، چناں چہ حضرت مولانا ایوب صاحب صوفی کوساڑی مدینہ منورہ اور حضرت مولانا عبدالرشید صاحب اور حضرت مولانا یوسف صاحب ریاض تشریف لے گئے تھے، تعلیم کے اختتام پر ان حضرات ادام اللہ فیوضہم علینا کی فلاح دارین میں واپسی ہوئی تھی۔ ہم اہل گجرات کی لسانی ناداری کا رونا کون روئے، ہم میں سے بعض کی مادری زبان گجراتی اور بعض کی اردو، لیکن وہ بھی اپنے معیار سے تہی دست اور ظلم برآں ظلم یہ کہ کتنی بھی تعلیم حاصل کرلیں، لب ولہجہ جان کا دشمن، ہمارے حضرت رئیس مرحوم کو یہ بات ہمیشہ کھٹکتی، اس لیے

ہمیشہ اس کی درستگی کی فکر فرماتے، کسی بھی لفظ کا غلط القاء سوہان روح کا باعث بنتا، حالاں کہ رئیس مرحوم طبعی طور پر خوش دلی اور مزاحی مزاج کے مالک تھے۔ اساتذہ کی غیر موجودگی میں طلبہ کو دفتر میں بلاتے، کبھی بہترین گجراتی میں بات فرماتے، تو کبھی اردو میں، اکثر شورش کاشمیری اور ابوالکلام آزاد کا ذکر کرتے اور ان کے انداز خطابت کو سراہتے، ہم گجراتی تو زبان و ادب کے معاملے میں ہمیشہ پیچھے رہتے، رئیس مرحوم ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ اکثر فلاحی فضلاء زبان و ادب کے لحاظ سے اوروں سے آگے دکھائی دیتے، رہی عربی زبان تو دارالعلوم میں اکا دُکا طلبہ ہوتے، جو عربی بول چال کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے، البتہ اساتذہ کی محنت اور لگن سے ہر جماعت میں دو تین ایسے طلبہ ہوتے جو عربی شروحات کے مطالعے پر قادر ہوتے، اکثر طلبہ عربی سے کتراتے نظر آتے، حضرت مولانا اقبال صاحب دیولا دامت فیوضہم کی آمد فلاح دارین میں عربی زبان کے لیے فصل بہار تھی۔ آپ کی ذات شروع ہی سے گویا عربی زبان کا ٹیپ ریکارڈ تھی، رئیس مرحوم شاید اسی کے انتظار میں تھے، حضرت کی آمد اور ہمارا عربی کا پہلا سال، عربی اول کی قصص النبیین اور معلم الانشاء کا سبق حضرت سے متعلق تھا، جیسے ہی آپ کی درس گاہ میں داخلہ ہوا، علیک سلیک اور ملاقات کے بعد فوراً قصص النبیین کے سبق "من کسر الأصنام" کی بسملہ ہوئی اور بسملہ پڑھتے ہی فلاح دارین نے گویا کروٹ لی، جو کسی نئے دور کی آمد کی آہٹ تھی۔ عربی کا پہلا سال، پہلی گھنٹی، استاذِ مکرم شیخ اقبال فلاحی ندوی مدنی کے ہاں کتاب قصص النبیین کا پہلا سبق "من کسر الأصنام" پہلی گھنٹی میں از اول تا آخر صرف اور صرف عربی کی گونج، پہلا سبق مکمل عربی میں پڑھایا، ترجمہ بھی عربی ہی میں ہوا، اردو کا کوئی نام ونشان نہیں، بہترین انداز دل کو چھو لینے والا لب ولہجہ، آواز کی گھن گرج، مترادفات کی بھرمار، گویا ایک نئے دور کا

آغاز۔جی ہاں یہ فلاح دارین میں ایک نئے دور کا آغاز تھا،ایک طرف مولانا اقبال صاحب، مولانا ارشدصاحب (جو ادیب صاحب کے نام سے معروف تھے)اور مولانا ایوب صاحب عربی زبان وادب کی داغ بیل ڈال رہے تھے،تو دوسری طرف مولانا یوسف صاحب ،مولانا محمد صاحب عمرواڑی صاحب وغیرہ نحو وصرف کی ادھیڑ بن میں مصروف تھے۔حضرت رئیس مرحوم اپنی باز نگاہیں گڑائے ہوئے حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھے، جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب عربی زبان وادب کی بساط بچھنا چاہتی ہے،تو اس کو مزید پروان چڑھانے میں اپنی مقدور بھر سعی کرنے لگے۔ دارالعلوم میں عربی اخبار و رسائل کی دست یابی ہونے لگی ،آپ طلبہ کو بلا بلا کر ان کی طرف مائل کرنے لگے، زبان و ادب کی اہمیت سمجھانے لگے اور اساتذہ سے اس معاملے میں کس طرح رہنمائی حاصل کی جائے ،اس کا گُر بتانے لگے،اساتذہ کی محنت،لگن اور انکی اہمیت سمجھانے لگے،اسلامی علوم و فنون میں عربی زبان وادب سے واقفیت اور اسلامی تہذیب وثقافت کے پروان چڑھنے میں اس کی قدر ومنزلت سے روشناس کرانے لگے،عربی ادب کی کتابوں اور رسائل سے بہترین جملے تلاشتے اور طلبہ کو اس کے القاء کا طرز بتلاتے اور اتنے شاندار طریقے سے اس کی تشریح فرماتے کہ طلبہ اس کی نقالی میں بےخود ہوجاتے ، اور اسی پر بس نہیں، بلکہ "النادی العربی" کو طلبہ کی ماتحتی سے نکال کر اساتذہ کے ماتحت کردیا، اس کا وقت تک بدل دیا، چناں چہ (النادی العربی) جمعرات کو مغرب بعد کے بجائے مدرسے کے وقت میں جمعرات ہی کے دن چوتھی اور پانچویں گھنٹی میں ہوتی، وہ دَور چوں کہ ٹیپ ریکارڈر کا تھا،تو عربی کے مشہور ومعروف خطباء کے خطبات کی کیسٹ لاکر ٹیپ کے زریعے طلبہ کو سناتے اور اس کے مطابق القاء کی ترغیب دیتے۔اسی دور میں ندوہ میں حضرت مولانا سید سلمان ندوی صاحب

جو کے جواں سال تھے عربی اور اردو میں ان کے بیانات اور وسعت معلومات کی گونج تھی، ان کو فلاح دارین میں مدعو کیا اور ان کے محاضرات کو سننے، جاننے اور محظوظ ہونے کے لیے طلبہ اور اساتذہ کو جمع کیا۔ اس کے بعد دو تین سال کے قلیل عرصے میں جیسے فلاح دارین میں عربی زبان وادب کی بہار آ گئی، ادھر حضرت مولانا بشیر صاحب خانپوری کی عربی استاذ کی حیثیت سے آمد ہوئی، تو دوسری طرف مزید مہارت پیدا کرنے کے لیے مولانا ایوب صاحب مولانا یوسف صاحب اور مولانا عبدالرشید صاحب کی سعودی عرب روانگی ہوئی، ان حضرات کی واپسی کے بعد عربی زبان وادب میں فلاح دارین کا طوطی بولنے لگا اور مِنی ندوہ اور ندوۂ ثانی کے نام سے جانا جانے لگا۔

جب اساتذہ کی ملک عرب سے واپسی ہوئی اور مولانا بشیر صاحب کا تقرر ہوا، اس کے بعد فلاح دارین میں عربی ادب کا ذوق پروان چڑھنے لگا، اس دوران ایک جملہ طلبہ کی زبان زد ہو گیا، جو عمر رسیدہ اساتذہ کی فکر کا گویا ترجمان بن گیا: ''جاؤ عرب! بولو عرب! اور کماؤ ارب!'' طلبہ میں کچھ بچکانہ پن بھی ہوتا ہے، ہمارا غالباً مشکوۃ کا سال تھا، حضرت مولانا شیر علی صاحب نور اللہ مرقدہ کے یہاں سبق تھا، حضرت مولانا علمی گہرائی، گیرائی اور تفوق میں اپنی مثال آپ تھے، پتا نہیں اس دن ساتھیوں کو کیا ہوا کہ بہت سے یہ جملہ گنگناتے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے، حضرت مولانا کے کانوں یہ جملہ پڑ گیا، مولانا چوں کہ تمام علوم وفنون میں طلبہ کی دلچسپی اور مہارت کے حصول کے خواہاں تھے، فوراً ابل پڑے اور فرمانے لگے: جب سے اقبال آیا ہے، سارے عربی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، بس دیگر فنون کی کسی کو فکر ہی نہیں، بھلا طلبہ کس بلا کا نام تھا، اس کے متصل ہی حضرت مولانا اقبال صاحب کے یہاں سبق تھا، وہاں جا کر مولانا کی بات اگل دی، پتا نہیں مولانا اقبال صاحب

اس دن کس رنگ میں تھے،فرمانے لگے: مولانا سے جا کر کہنا کہ ہم نے بھی یہیں پڑھا ہے، پوری کلاس میں دو تین طالب علم ہوتے تھے، جو عبارت پڑھ سکتے تھے، آج ہماری برکت سے ہر کلاس میں دس پندرہ طالب علم عبارت پڑھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔(وللہ الحمد) خیر دونوں حضرات میں استاذ شاگرد سے زیادہ باپ بیٹے کا رشتہ تھا، ایسے مکالمے کا حق ان ہی کو بنتا ہے۔

مجھے بتانا یہ تھا کے ہمارے رئیس مرحوم کی چاہت فلاح دارین کو عربی زبان وادب میں بام عروج پر پہونچانے کی تھی اور فلاح دارین بالآخر بام عروج پر پہونچ ہی گیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک یا بیرون ملک کی کبار شخصیات کا جب فلاح دارین میں ورود ہوتا، تو وہ بھی فلاح دارین کے تفوق کا اقرار کیے بغیر نہ رہتے، حضرت رئیس مرحوم عربی زبان وادب کو لے کر دیگر اساتذہ کے ساتھ حضرت مولانا اقبال صاحب سے ایسی گرویدگی کا مظاہرہ فرماتے جو شاید وباید ہی کہیں دیکھنے کو نصیب ہو۔

ہمارے یہاں جامعہ علوم القرآن (جمبوسر) میں جبکہ وہ اپنے ابتدائی دور میں تھا، ندوہ سے اہل علم کے ایک وفد کی آمد ہوئی تھی، جس میں سرفہرست حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی جو اہل علم کے یہاں علی میاں کے پیار بھرے نام سے متعارف ہیں، تشریف فرما ہوئے، ان کے اعزاز میں جامعہ کی وسیع وعریض مسجد میں ایک بڑے جلسے کا انعقاد ہوا، جس میں حضرت کے نام ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا، جو حضرت مولانا اقبال صاحب کا تحریر کردہ تھا، اس کو پیش کرنے والے یہاں کے ایک مؤقر استاذ حضرت مولانا مفتی ابراہیم صاحب کاوی تھے، جنہوں نے شاندار انداز میں اس کو پڑھا، حضرت علی میاں طاب اللہ ثراہ اس سے کافی محظوظ ہوئے، اور اپنے خطاب کے دوران فرمایا: جہاں ایسے عربی کے لکھنے

والے اور پڑھنے والے موجود ہوں،اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ادارے کا مستقبل روشن ہوگا۔آج ہمارا جامعہ علوم القرآن ترقی کی جس راہ پر ہے،اس کو دیکھ کر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت علی میاں کے اس کرامتی جملے کی حسین تعبیر ہے۔ پھر جیسے ہی جلسے کا اختتام ہوا تو مہمانوں میں ہمارے حضرت رئیس مرحوم بھی تھے،جیسے ہی آپ اپنی نشست سے اٹھے، میں بھاگ کر آپ کے ساتھ ہولیا اور عرض کرنے لگا کہ باجی! آج جو سپاس نامہ پیش ہوا اور علی میاں نے اس کی بہت تعریف کی ، وہ ہمارے مولانا اقبال صاحب کا تیار کیا ہوا تھا،حضرت رئیس مرحوم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: بھائی جمبوسری! اس کی پہلی سطر سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ میرے اقبال کا لکھا ہوا ہے،بھلا گجرات میں اس سے بڑھ کر کون بڑا ادیب ہے؟

حضرت رئیس مرحوم عزم وحوصلہ کی وہ مثال تھے،جس کی نظیر ملنا مشکل ہے،آپ کسی بھی شعبہ میں ایک ہدف طے کرتے ، اس کے مناسب اشخاص کا تعین کرتے ، ان کے لیے ان کی من مرضی کا ماحول تیار کرتے اور اپنا ہدف پورا کرتے ۔آپ کی سب سے بڑی خوبی جو آپ کو اپنے ہم عصروں سے ہی نہیں، بلکہ اپنے اگلوں سے بھی ممتاز کرتی ہے وہ یہ تھی کہ ہر شعبہ کی کامیابی کا انتساب دوسروں کی جانب کرتے ، حالاں کہ کامیابی کا اصل باعث رئیس مرحوم ہی کی ذات ہوتی۔آپ لائق اشخاص کے لیے مدرسہ کے اصول وضوابط میں اس حد تک گنجائش نکالتے کہ سامنے والا حیران رہ جاتا ،آپ کی طبعی ظرافت، وسعت قلبی اور فراخیٔ فکر تک رسائی اوروں میں مشکل سے ہی نظر آ سکتی ہے۔ان سب میں آپ کی ذاتی صلاحیت ، بلند حوصلگی، بالغ نظری ، بلند اخلاق و کردار ،سوختہ قلب ،دعائے نیم شبی اور صاف شفاف شخصیت کا بڑا اہم رول رہا۔خدا کرے کوئی اور عبداللہ پیدا ہوجائے جو رئیس

مرحوم کے اِستادہ منارۂ نور کی روشنی میں رئیس مرحوم کی قائم کردہ فلاحی اقدار وتشخصات کی انفرادیت کوقائم ودائم رکھ سکے۔

رئیس مرحوم اورشعبۂ تجوید:

فلاح دارین میں جس وقت ہمارا داخلہ ہوا،حضرت قاری صدیق صاحب دامت برکاتہم درجۂ مشکوٰۃ میں زیر تعلیم تھےاور تین قراء حضرات مسند تجوید پر براجمان تھے،حضرت مولانا قاری عباس صاحب دھرم پوریؒ،حضرت مولانا قاری وارث صاحب بمبوی (جواصل بنگالی تھے وہ ابھی نو فارغ تھے،حضرت الاستاذ قاری صالح صاحب جوگواڑی چوں کہ سفرحج میں تھے،تو ان کا ان کی جگہ عارضی تقرر تھا،بہترین آواز کے مالک تھے)اور تیسرے حضرت مولانا قاری انیس صاحبؒ تھے۔تجوید کے لیےعربی دوم تک ہر جماعت دوحصوں میں تقسیم ہوتی تھی،ایک جماعت قاری صالح صاحب کے یہاں اور دوسری جماعت قاری عباس صاحب کے یہاں،جو جماعت قاری عباس صاحب کے یہاں ہوتی وہ عربی سوم میں بھی انہیں کے یہاں رہتی اور قاری صالح صاحب کی جماعت حضرت قاری انیس صاحب کے یہاں منتقل ہوتی۔پھرعربی چہارم سے تجویداورانگلش میں اختیار دیا جاتا،تجوید کے لیے پھر مشکوۃ تک قاری انیس صاحب کی کلاس ہوتی۔چند سالوں کے بعد پھر قاری صالح صاحب کناڈا منتقل ہوگئے۔اس کے بعدتو ان کی کلاس میں قراء حضرات کا تانتا لگ گیا: قاری داودصاحب،قاری الیاس صاحب،قاری ہارون سودانی صاحب،قاری ایوب افریقی صاحب وغیرہم۔البتہ ہمارے دور میں قاری عباس صاحب 9 سال تک رہے،ان کے بعد ان کی جگہ قاری صدیق صاحب مسند تجوید پرجلوہ افروز ہوئے۔اورقاری انیس صاحب بھی اپنی حیات کے آخری لمحے تک شعبۂ تجوید کے کھیون ہار رہے۔

مادرعلمی فلاح دارین میں شعبۂ تجوید کو لے کر حضرت رئیس مرحوم اور دونوں قراء حضرات: حضرت قاری عباس صاحب اور قاری صالح صاحب میں البیلی یگانگت رہی اور تینوں حضرات کی یکساں مساعی سے شعبہ تجوید پھلنے پھولنے لگا، البتہ وہ قراءتِ حفص تک محدود تھا، حضرت رئیس مرحوم جوادبی ذوق اور ہر کام میں نفاست کے پرزور داعی اور حمایتی تھے، ہر کام میں بلندی اور عالی قدر کے خواہاں تھے، ذراسی خلافِ طبع حرکت آپ پر بڑی شاق گزرتی، اس کی کبیدگی کا اثر آپ کے سراپا وجود کو متأثر کرتا، جو بھی زبان ہو اس میں ادنی سی لغزش پر بھی سرزنش کرتے اور اس میں بھی قرآن کریم کی تلاوت میں اگر صحت میں چوک ہوتی، تو وہ برداشت سے باہر ہوتی، آپ ہمیشہ فرماتے کہ دارالعلوم میں پڑھنے والا طالب علم اور فاضل تلاوت وتعلیم، اذان واقامت، جمعہ کے خطبے اور نماز میں غلطی کرے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صحت میں ادنی سی چوک، عربی زبان کے مزاج ومذاق کی نزاکت کو تیرہ وتار کردیتی ہے اور مطالب ومعانی میں تحریف کے مترادف ہے، پھر ہم گجراتیوں کی زبان کی بے رخی پر خوب نالاں ہوتے۔ آپ کی اسی سوچ نے فن تجوید میں انقلاب کی راہ ہموار کرنے پر آپ کو ابھارا۔ آپ کی وسعت نظر میں گجرات کے مکاتب ومدارس میں صحت حروف کی زبوں حالی اور بے اعتنائی مخفی نہیں تھی۔ آپ کی دوررس فکر ونگاہ نے یہ تاڑ لیا تھا کہ اس مرض کا مداوا کس علاج میں مضمر ہے اور اس علاج کی ابتدا کے لیے فلاح دارین ہی کو مشق گاہ بنایا۔

علم تجوید اپنی اہمیت جلیلہ کے باوجود ایک مظلوم فن کی حیثیت سے مدارس و جامعات کی چہار دیواری میں محبوس تھا، اپنی جلالت شان کے پیش نظر وہ جس اعتناء، توجہ، محنت، لگن اور لگاؤ کا حقدار تھا، اس سے محروم تھا، خود ہمارے گجرات کا یہ حال تھا کہ خال خال

اچھی قراءت مع رعایتِ تجوید سننے کو ملتی۔ ہمارے صوبے کا ایک ایک چپہ جہاں مکاتب و مساجد کا جال بچھا ہوا تھا، وہ بھی حسنِ تجوید اور اس کی زینت سے عاری تھا۔ **ورتل القرآن ترتیلا**، "وعلم التجوید حتم لازم" کے فرمان اور "اقرؤوا القرآن بلحون العرب" کی مَنادی کے باوجود عجمی طریقۂ تعلیم جس میں مجہولات اور لحن جلی وخفی کی بھرمار تھی رائج تھا، قراءتِ قرآن اور نماز جیسی عبادت تجاہل عارفانہ کا شکار تھی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات کو بدلنے کا بیڑا اٹھانے والی اگر کوئی ذات تھی تو وہ حضرت رئیس مرحوم کی ذات تھی، جس میں وقت کے دھارے کو بدلنے کا مادہ اور دم خم تھا، جو وقت کے دھارے کو اپنے پختہ عزم و حوصلے کے بل بوتے پر شریعت کے صحیح سانچے میں ڈھالنے کا خوگر تھا۔

فلاح دارین تلاوت قرآنی کی صحت کو لے کر کافی کریزی رہا ہے، اس کے در و دیوار قرآنی نغمہ سرائی کی صدائے بازگشت سے ہمیشہ گونجتے رہے ہیں، ہمارے داخلے سے لے کر ایک مدت مدیدہ تک قاری ہارون سودانی کی رہائش مسجد کا برآمدہ رہا، مدرسے کے خارجی اوقات میں وہاں بیٹھ کر چاہے پھر وہ دوپہر کا وقت ہو یا شام کا یا رات کی تاریکی کا، عربی لب ولہجے سے لیس، بلند اور شیریں آواز میں تلاوت کلام پاک سے فلاحی در و دیوار کو آباد رکھتے، سارے ہی طلبہ کا یہ مزاج بنا ہوا تھا کہ مغرب سے لے کر رات 12 بجے تک جب بھی بجلی کا فقدان ہوتا، درس گاہ و مسجد سے قراءت کا شور اٹھتا، یہاں تک کہ ہم جیسے جن میں قراءت کا سلیقہ نہ ہوتا، وہ بھی ان میں شامل ہوجاتے، اس وقت ہم جیسوں کے لیے گجراتی کا ایک جملہ بہت معروف تھا کہ "بھائی آپ رہنے دو، ورنہ بھینسیں بے قابو ہو جائیں گی" وہ ٹیپ کا زمانہ تھا، اکثر کمروں سے جمعہ کی صبح مشہور اور نام آور مصری قاریوں کی تلاوت سے ایک سماں بندھ جاتا، قاری صاحبان کی محنت، طلبہ کا ذوق ولگن، اچھے پڑھنے

والوں کا رئیس کی نگاہ میں بچ جانا اوران کی خاطر خواہ پذیرائی، اذان واقامت ونماز اور جلسے جلوس اور بڑی شخصیات کی آمد پران کوآگے کرنا اوران کے لیے بلند کلمات کا کہنا، ان سب باتوں نے تجوید کے لیے ایک سازگار ماحول کھڑا کر دیا۔ مزید براں لجنۃ القراءۃ کے قیام نے مزید جان پھونکنے کا کام کیا، لیکن ان سب کے باوجود شعبۂ تجوید میں فنی حیثیت سے ابھی تشنگی تھی، اس کو سیرابی میں بدلنے کا عظیم کارنامہ انجام دینے والی دو شخصیتیں تھیں: ایک حضرت رئیس مرحوم اور سرخیل قراء حضرت قاری انیس مرحوم رحمہما اللہ۔

حضرت رئیس مرحوم کا قاری انیس صاحب کو کھوجنا اور قاری صاحب کی فلاح دارین میں آمد دنیائے تجوید کے دور تجدید کی داغ بیل تھی، جن کی انتھک کوششوں نے ایک ایسی عبقری شخصیت کو جنم دیا، جس کے تجدیدی کارناموں نے اسلاف کے دور کی یاد تازہ کرادی۔ ہمارے حضرت رئیس مرحوم اپنی ذاتی صلاحیت، علو ہمت، بلند حوصلگی، دور بینی، دور اندیشی اور خداداد فراست سے فلاح دارین کو ایک مثالی ادارہ بنانے کے مشن میں ایک فوجی جرنیل کی طرح ہمہ وقت مصروف تھے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ بیک وقت تعلیمی وتربیتی ہر محاذ پر اپنی پینی نگاہ گاڑے رہتے، تعلیم وتربیت کے ہر شعبے کے لیے اس کے مناسب شخصیت کا انتخاب حضرت رئیس کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو رہا ہے، ہر شخصیت کے انتخاب میں جہاں علمی صلاحیت کی پرکھ ہوتی، وہیں اخلاقی پہلو بھی پیش نظر رہتا، اور اسی پر بس نہ فرماتے بلکہ طلبہ کے سامنے ان کے علمی مقام اور للّٰہیت وخلوص کی وہ تصویر کشی فرماتے کہ طلبہ ہمیشہ ان کے سامنے بچھے رہتے، اس میں بڑی بات یہ ہوتی کہ اساتذہ کے مقام ومرتبہ کو آشکارا کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی ذات کو پرے رکھتے، اس اللہ کے بندے نے دوسروں کو بلند کرتے ہوئے اپنی ذات کے لیے کبھی بڑائی کا ایک لفظ نہیں کہا،

حالاں کہ ایک دنیا آپ کی عظمت و وقعت کی دلدادہ تھی ،آپ کی اسی کسر نفسی نے فلاح دارین کو وہ قدر و منزلت عطا کی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔آپ فلاح دارین کے کسی بھی شعبے پر نظر دوڑ ایئے ، وہ کل بھی مثالی تھا جب ان کا وجود تھا،اور آج بھی مثالی ہے جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، چاہے شعبۂ حفظ ہو یا تجوید، شعبۂ حدیث و فقہ ہو یا تفسیر،شعبۂ علم کلام ہو یا منطق ،شعبۂ بلاغت ہو یا ادب ،اس میں بھی شعبۂ عربی ادب اور شعبۂ تجوید نے وہ درک اور کمال حاصل کیا، جو اس کی وجہ امتیاز بن گیا اور اسی امتیاز و خصوصیت نے فلاح دارین کو ایسی انفرادیت عطا کی ،جس کی نظیر مدارس و جامعات میں عنقا نہ سہی ،مشکل ضرور ہے اور یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہیں، اس لیے کہ فلاح دارین کی ترقی اور اٹھان میں اس کے مالی نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا۔شعبۂ تجوید ہی کو لیجیے،اس کے لیے ایک صاحب فن کی کمی کا احساس ہوتے ہی،آپ کی دور رَس نگاہ ملک بھر کے طول و عرض کی آبلہ پائی کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے شہر کی ایک چھوٹی سی مسجد میں گمنامی کی زندگی جی رہی ایک ایسی شخصیت پر پڑتی ہے، جو ملازمت کے اصول سے بے پرواہ اور تدریسی جکڑ بندی سے آزاد رہنے کی خواہاں ہے،جس کے پاس تجوید کی روح کہی جانے والی صحت کا علم تو ہے، پر اس کی جان کہی جانے والی دل کش صوتی ہنر مندی کا فقدان ہے،اگر رئیسِ مرحوم کی جگہ اور کوئی ہوتا،تو اپنی آبلہ پائی پر کفِ افسوس مَلتا،لیکن ہر ایک میں جوہر دانی کا گر کہاں؟ بس مچل پڑے کہ حضرت آپ کو ہمارے یہاں آنا ہی ہوگا، وہ بھی عجیب انسان کہ آؤں گا تو سہی، پر اپنی شرط پر آؤں گا، نہ نماز پڑھاؤں گا، نہ جلسے جلوس میں قرآن پڑھوں گا۔ وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ گم نام گلی میں ایک گم نام شخص کی منت سماجت کرنے والا کوئی معمولی شخص نہیں ہوسکتا، بالآخر مان گئے۔حضرت رئیس نے اپنی فراستِ ایمانی سے تاڑ لیا

تھا کہ یہ ہے اصلی ہیرا، جس کی چمک بہت جلد اپنا کمال دکھلائے گی۔ چناں چہ ان کو لے کر آ گئے۔ یہ تھی وہ عظیم شخصیت جس کے دیدار کو آج آنکھیں ترستی ہیں۔ جس کو علمی دنیا قاری انیس صاحب کے نام سے جانتی ہے، یہ آئے پر اپنی مرضی کے مالک رہے، جب چاہا جس کو چاہا پڑھایا، پر ایسا پڑھایا کہ اس کے پاس پڑھنے والوں نے سب کو پڑھایا۔

ان سے متعلق ایک قصہ حضرت رئیس بڑے چاؤ سے سناتے کہ ایک مرتبہ میں اور حاجی موسیٰ راوتؒ باغ میں بیٹھے ہوئے اساتذہ کو لے کر محوِ گفتگو تھے کہ حاجی موسیٰ کہنے لگے مولانا! آپ یہ کیسا قاری لائے ہیں، جو نہ نماز پڑھاتا ہے نہ کبھی قراءت سناتا ہے؟ آپ اس کو کہتے کیوں نہیں؟ حضرت رئیس نے فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا، آپ کو کہنا ہو تو کہو، حاجی موسیٰ نے کہا: اگر میں کہوں گا تو وہ کیا کہیں گے؟ حضرت رئیس نے فرمایا: وہ کچھ نہیں کہیں گے بس یہاں سے چلے جائیں گے۔ حاجی موسی نے کہا: اگر وہ چلے جائیں گے تو کیا فرق پڑے گا، حضرت رئیس نے فرمایا: بہت فرق پڑے گا، ان جیسا دوسرا نہیں ملے گا، ان کو ہماری ضرورت نہیں ہے، پر ہم کو ان کی ضرورت ہے۔

حضرت رئیس مرحوم حضرت قاری انیس صاحبؒ کے بارے میں ایک جملہ ارشاد فرماتے کہ وہ فن کے آدمی ہیں، بڑے کام کے ہیں ''وہ آدمی ہے فن کا، میرے بڑے کام کا'' اور واقعہ بھی یہی تھا، حضرت قاری صاحب کی آمد سے پہلے فن تجوید ایک محدود دائرے میں محصور تھا، آپ کی آمد کے بعد اس کو وہ وسعتیں میسر ہوئیں، جو سوچ سے پرے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک قاری کا تصور صحتِ حروف، اچھی آواز، عمدہ لب ولہجہ اور اس کا زیر و بم اور چند کتابیں جیسے: فیض العزیز، جامع الوقف، فوائد مکیہ، خلاصہ اور جزری وغیرہ میں محدود تھا، حضرت قاری صاحب جید الاستعداد اور ایک متبحر عالمِ دین اور کثیر المطالعہ شخص تھے،

تجوید کی ابجد سے لے کر اس کے منتہا تک کے عالم تھے، ان کی اس وسعت علمی نے شعبہ تجوید وفنِ تجوید میں وسعت کا دروازہ کھول دیا، اور یہ دین کا ایک اہم شعبہ اپنے تنگ دائرے سے نکل کر آفاق کی وسعتوں کو چھونے لگا، پھر چاہے اس کی قراءت حفص ہو، سبعہ عشرہ ہو یا اربع عشرہ، ہر طرف اس کی پذیرائی شروع ہوئی اور اس میں سب سے بڑا کردار نبھانے والی شخصیت حضرت قاری صدیق صاحب کی تھی، قاری صدیق صاحب جس وقت درجۂ مشکوۃ میں تھے، ان سے بھی زیادہ اچھے پڑھنے والے فلاح دارین میں موجود تھے، بلکہ آپکے ساتھی قاری امین مانگرولی کا تدویری اور حدری لہجہ اور انداز فلاحِ دارین میں ایک لمبے عرصے تک چھایا رہا۔ قاری زبیر لالہ، قاری عمران افریقی، قاری ہارون سودانی، قاری ایوب افریقی وغیرہ۔

قاری صدیق صاحب ویسے تجوید ہی کے آدمی تھے، لیکن طالبِ علمی کے زمانے میں وہ نعت خوانی اور نظم کو لے کر زیادہ مشہور تھے، شاید ہی فلاح دارین میں بجنے والی کیسٹ ان کی نعت ونظم سے خالی ہو، اس میں بھی جب آپ کی فراغت کا سالانہ جلسہ ہوا، جس میں حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ کی صدارت تھی، اس میں مشہورِ زمانہ ترانۂ دارالعلوم جو مولانا ریاست علیؒ کا منظوم کردہ ہے: "یہ علم و ہنر کا گہوارہ" اس کو اس شان سے پڑھا کہ برسوں اس کی گونج فلاح دارین میں سنی گئی۔ کہا جاتا تھا کہ اس ترانے کو پڑھنے کے لیے قاری صاحب نے اتنے دیسی انڈے پیے تھے جو ایک ریکارڈ ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ جن کے بارے میں، میں لکھ رہا ہوں وہ میرے استاذ ہیں، میں نے ان سے پڑھا ہے، جہاں میں نے ان کی ڈانٹ اور مار کھائی ہے، وہیں ان سے اپنے لیے اچھی باتیں بھی سنی ہیں، جہاں ان کو غصہ

دلایا ہے، وہیں ان کو ہنسایا بھی ہے، ان کی خوشی اور غم میں شریک بھی رہا ہوں، ان کے گھر کا کھایا پیا بھی ہے، ہمیشہ ان کے حسن سلوک اور احسان کا قدردان بھی رہا ہوں، میرے سارے اساتذہ علم وعمل اور اخلاق وکردار کے اس بلند مقام پر براجمان ہیں، جس کو تحریر میں لانا نہ میری بساط میں ہے نہ میں اس کے قابل، البتہ ان کے باب میں جو میرے جذبات واحساسات ہیں، ان کو تحریری شکل میں پیش کرنے کا مقصد اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار ہے اور بس۔

خیر! حضرت قاری صدیق صاحب کی تجوید کی گرویدگی، آپ کا مظبوط سینہ، لمبا سانس اور بہترین آواز اور ادائیگیِ حروف کی نفاست اور اپنے مقصد کو پانے کی دھن نے حضرت رئیس مرحوم کو کافی متأثر کیا تھا اور اسی تأثر نے آگے کی راہ ہموار کردی اور خود کو اپنے استاذ حضرت قاری انیس صاحب کی چوکھٹ پر ڈال دیا اور قاری صاحب کی شاگردی میں ایسا مٹایا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

حضرت قاری انیس صاحب ذاکر، شاکر، زاہد، متقی اور ولی صفت درویش انسان تھے، طبیعت کے نازک اور مزاج کے مستقل انسان تھے، تعلیم کے ان کے اپنے اصول تھے، تدریسی اور ملازمتی جکڑ بندیوں سے آزاد تھے، جس میں طلب اور مٹنے کی چاہ ہوتی، وہی شاگردی کے لائق ٹھہرتا، تو دوسری طرف قاری صدیق صاحب قوی الجثہ، نڈر اور جری انسان، کسی سے دب کر رہنا آپ کی فطرت سے کوسوں دور، لیکن پھر بھی اپنے آپ کو ان کی شاگردی کے لیے مٹایا۔ آپ تصور کیجیے! ایک انسان فلاح دارین کی مسند پر براجمان ہو، طلبہ میں اس کی دھاک ہو، اس کی مزید حصولِ علم کے لیے اپنے ایسے استاذ سے وابستگی جو انتہائی نازک مزاج ہو، چناں چہ رات میں عشاء کی نماز کے بعد، ایک ہاتھ میں کتاب اور

دوسرے میں روشن کی ہوئی لالٹین لے کر طلبہ کے دارالاقامہ میں حضرت قاری انیس صاحب کے رہائشی کمرے میں آتا اور ذرا سی خلافِ طبع بات پر کمرے سے باہر اپنے شاگردوں کی آمد ورفت والے راستے پر سزا کے طور پر کھڑا کر دیا جاتا اور اللہ کا بندہ اُف تک نہ کہتا اور معافی کے بعد مسکراتے ہوئے زانوئے تلمذ طے کرتا، یہ کوئی اور نہیں، یہ حضرت قاری صدیق صاحب سانسرودی کی ذات گرامی ہے، کوئی دوسرا ہے جس کی ایسی مثال پیش کی جاسکے؟ اسی لیے پوری جرأت کے ساتھ برملا یہ کہنے میں حق بجانب ہوں، جیسا کہ اپنے بڑوں سے جانا کہ حضرت مولائے روم اپنے شیخ حضرت تبریز کی زبان بنے، حضرت نانوتویؒ اپنے شیخ حاجی امداداللہؒ کی زبان کہلائے۔ اسی طرح حضرت قاری صدیق صاحب اپنے استاذِ بزرگوار حضرت قاری انیسؒ کے علم وکمال کے امین و پاسبان کہلائے۔

حضرت رئیس مرحوم علماء وطلبہ کو قدم قدم پر سنن کے پاس ولحاظ کی تلقین فرماتے، دوپہر کے وقت جب طلبہ کھانے کے لیے مطعم میں حاضر ہوتے، تو حضرت نگرانی کے لیے تشریف فرما ہوتے، کھانے سے پہلے اس کے آداب بیان کرواتے، پہلے مطعم میں میز اور کرسی نما بڑی بینچ ہوا کرتی تھی، جس پر آمنے سامنے 6 یا 8 طلبہ کھانا تناول فرماتے، ہر ایک پر آپ کی گہری نظر ہوتی اور صفائی ستھرائی کی تاکید فرماتے۔ ایک مرتبہ فلاح دارین کے محسنِ خاص جناب حاجی یوسف راوت صاحب کی علماء اور طلبہ کی ایک پرتکلف دعوت پر، مطعم سے متصل ایک کشتی نما غسالہ بنا ہوا تھا، جہاں طلبہ ہاتھ منہ کی صفائی کرتے، چکناہٹ کی وجہ سے اس کی جالی جہاں سے گندے پانی کا نکال ہوتا جام ہوگئی، سارا گندا پانی جمع ہوگیا، طلبہ آتے اور ناک منھ سکوڑ کر باہر نکل جاتے، اتفاق ایسا ہوا کہ راقم الحروف، مولوی حنیف رویدروی اور حضرت کے صاحب زادے حافظ ابراہیم کھانے سے فارغ ہوکر ایک ساتھ

ہاتھ دھونے کے لیے آگے بڑھے، ہمارے پیچھے حضرت رئیس بھی آئے، ہم گندے پانی سے لبالب غسالے کو دیکھ کر ہاتھ دھونے سے ہچکچا رہے تھے، اس کو حضرت رئیس نے تاڑ لیا، آپ آگے بڑھے آستین چڑھائی اور اپنا ہاتھ اس گندے پانی میں ڈال کر جالی کی صفائی کر دی، جس سے رکا ہوا پانی واپس بہنے لگا اور غسالہ صاف ہو گیا، پھر ہم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: اگر آپ ہاتھ ڈالتے تو چھوٹے باپ کے ہو جاتے، اگر ہم ہی صفائی سے جی چرائیں گے، تو پھر صفائی کا خیال کون رکھے گا؟

ہمارے حضرت رئیس مرحوم دور اندیش، جہاں دیدہ، ہر ایک کی نفسیات سے واقف، خوش وضع قطع اور ایک زندہ دل شخصیت تھے، طلبہ کی تربیت میں آپ کا انداز انتہائی مشفقانہ ہوتا، آپ ہر جمعہ کو صبح ناشتے کے بعد دارالاقامہ تشریف لاتے، ایک ایک کمرے کی صفائی کا جائزہ لیتے، بستر اٹھاتے، کھٹمل کی جانچ کرتے، دوائی کا چھڑکاؤ کراتے، ایک ایک کونے کو جانچتے اور اس دوران دل لگی کے ایسے جملے استعمال فرماتے کہ ماحول میں مسکراہٹ بکھر جاتی اور طلبہ خوشی خوشی کمرے کی صفائی میں لگ جاتے، اس دوران طلبہ کے کپڑوں اور سر کے بالوں پر بھی آپ کی نظر رہتی، ہمارے وقت میں طلبہ میں بغیر کالر کے کرتے کی فیشن چل نکلی، ویسے ہی جیسے ماضی قریب میں سیاہ کرتے کی فیشن چل نکلی تھی، اکثر طلبہ بلا کالر کے کرتے میں نظر آتے، اتفاق سے ایک استاذ بھی ایسا کرتا زیب تن کر رہے تھے، حضرت رئیس نے طلبہ کو منع کرنا شروع کیا، ایک طالب علم کو اس پر سختی سے ڈانٹا، تو اس نے برجستہ جواب میں کہا: ہمارے استاذ بھی ایسا کرتہ پہنتے ہیں، اس نے ان کا نام لیا، حضرت رئیس پر سکتہ طاری ہو گیا، پھر فرمایا: اچھا تو آپ اپنے استاذ کی اقتداء میں پہنتے ہیں، آپ نے اسی وقت ایک طالب علم کو کھڑا کیا اور اس کو استاذ کے پاس بھیجا کہ جاؤ معلوم کرو کہ

وہ کس لیے ایسا کرتہ پہنتے ہیں؟ اس نے واپس آ کر استاذ کی بات بیان کی کہ کالر کی وجہ سے پسینہ زیادہ ہوتا ہے، اور تر ہو کر جلدی میل پکڑتا ہے تو بجائے تین یا چار دن کے دو دن میں کرتہ بدلنا پڑتا ہے، بلا کالر کے کرتے میں گرمی بھی نہیں ہوتی اور جلدی میلا بھی نہیں ہوتا، حضرت نے یہ سن کر فرمایا: الحمد للہ! میں سمجھ گیا تھا کہ مولانا کی نیت اور ہے اور آپ کی اور، پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: اب یہ مت پہننا۔

حضرت رئیس استقلال وثبات کے پہاڑ تھے۔ اپنی فراست سے جو فیصلہ کرتے، اس کے نفاذ میں ایسی حکمت عملی بروئے کار لاتے کہ اس سے بہتر کا تصور مشکل ہوتا، ریونین کے تین بچوں کا فلاح دارین میں داخلہ ہوا، تینوں کم عمر تھے 14 یا 15 سال کی عمر ہوگی، لیکن تھے بے حد شرارتی، اپنی حرکتوں سے ایسا اودھم مچایا کہ سب کو پریشان کر دیا، مدرسہ کے پلنگ تک بیچ دیے، آخر تنگ آ کر ان کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا، وہ اتنے شاطر تھے کہ فرانس کی ایمبیسی میں مدرسہ کے خلاف ایک شکایتی خط بھیجا، دہلی ایمبیسی سے فرانس کے افسران کا عملہ تحقیق وتفتیش کے لیے فلاح دارین آیا، ان کی پرسنالیٹی ایسی کہ کوئی بھی دیکھ کر دنگ رہ جائے، دوپہر کا وقت تھا، وہ دارالعلوم کے چوراہے پر کھڑے تھے، اس وقت حضرت رئیس بَنا محلے والے مکان میں رہتے تھے، طلبہ ظہر کی نماز پڑھ کر نکلے، ان کو دیکھا تو سب جمع ہو گئے، ادھر حضرت رئیس بھی دارالاقامہ والے گیٹ سے مدرسہ میں داخل ہوئے، طلبہ آپ کو آتا دیکھ کر درسگاہ میں جانے لگے، اس وقت حضرت رئیس ایسے وقار واستقلال کے ساتھ داخل ہوئے کہ آدمی دیکھتا رہ جائے: سفید لباس میں ملبوس، آنکھوں پر ٹھنڈک کا چشمہ، سر سفید رومال سے ڈھکا ہوا، ہاتھ میں چھڑی اور رعب وداب والی چال، بلا کی خوب صورتی، بس دیکھتے رہ جائیں، ہم نے برابر دیکھا کہ فرانس کے افسران نے جب حضرت

رئیس کو آتا دیکھا، تو ان کے انداز سے اتنے متأثر ہوئے کہ ادب کے انداز میں کھڑے رہ گئے، پھر ملاقات ہوئی، ان کو آفس میں بٹھایا، ریونین کے بڑے طلبہ یعقوب مُلا اور زبیر لالہ کو بلا کر ترجمان بنا کر طلبہ پر کاروائی کی، ایسی ترجمانی کی کہ افسران مطمئن ہو گئے اور بعد میں انہوں نے ہی ان کی واپسی کا نظم کر دیا۔ اگر کسی بڑی شخصیت میں عفو وحلم، چشم پوشی و درگزر کی صفات جلوہ گر ہوتی ہیں، تو وہ اس کے عظیم المرتبت ہونے پر مہر ثبت کر دیتی ہیں، حضرت رئیس مرحوم ایک مسلم شخصیت ہونے کے ساتھ، ان صفات سے بدرجۂ اتم متصف تھے اور ان ہی صفات نے سب کو آپ کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ فارسی کا یہ مشہور مقولہ آپ کی زبان زد رہتا "گر فرق مراتب نکنی زندیقی" اس کے پیش نظر ہر ایک سے معاملہ فرماتے۔

آپ فلاح دارین کے کرتا دھرتا تھے، بڑے ہوں یا چھوٹے، سب آپ کا کہا کرتے اور کبھی کوئی اونچ نیچ ہوتی، تب آپ کا بڑکپن ظاہر ہوتا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا غلام وستانوی صاحب کی دعوت پر جامعہ اکل کوا کے لیے رابطۂ عالم اسلامی کے صدر شیخ عبداللہ عمر نصیف کی سورت تشریف آوری ہوئی، طے یہ ہوا کہ سورت سے سڑک کے راستے ترکیسر سے ہوتے ہوئے اکل کوا پہنچیں گے، حضرت رئیس نے بصد اصرار فلاح دارین تشریف آوری کی دعوت پیش کی، لیکن وہ منظور نہ ہوسکی، حالاں کہ آپ ان کے قافلے میں شریک تھے، آپ نے ان کو ٹھہرانے کی یہ ترکیب نکالی کہ ان سے کہا: ٹھیک ہے اتنی اجازت دیجیے کہ فلاح دارین کے اساتذہ وطلبہ بس اسٹینڈ پر جہاں سے ہمارا قافلہ گزرے گا شیخ کے استقبال میں موجود رہیں اور ان کے دیدار سے مشرف ہوں اور مدرسے کی طرف سے کچھ ہدایا پیش کریں۔ یہ درخواست منظور ہوئی، فلاح دارین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، آناً فاناً بینر وغیرہ تیار کیے گئے، کچھ نارے چنے گئے، ہدیہ پیش کرنے کی ذمہ داری دو استاذوں

کے سپرد ہوئی، اساتذہ کی معیت میں پورا فلاح دارین سڑک پر نکل آیا، جیسے ہی اسٹینڈ پر شیخ کی گاڑی رکی، طلبہ نے استقبال میں "الشیخ عمر یعیش" "رابطة العالم الإسلامی تدوم" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا، چوں کہ شیخ کی گاڑی قافلے سے کافی آگے چل رہی تھی، ابھی حضرت رئیس کی گاڑی کافی پیچھے تھی، جیسے ہی شیخ کی گاڑی رکی اساتذہ ہدیہ لے کر آگے بڑھے، گاڑی کا دروازہ کھلا، ہدیہ قبول کیا اور فورا آگے بڑھ گئے، نہ باہر نکلے نہ دیدار ہوئے، جیسے ہی حضرت رئیس اسٹینڈ پر پہنچے بے چین ہو گئے، اساتذہ سے حالات دریافت کیے، اساتذہ نے بتلایا کہ کچھ سیکنڈ کے لیے رکے اور ہدایا لے کر آگے بڑھ گئے، یہ سن کر حضرت رئیس کا ماتھا ٹھنکا، آگ بگولہ ہوئے، اور فرمانے لگے آپ اتنے سالوں سے میرے ساتھ رہتے ہو، آپ نے کیا سیکھا؟ اتنا بڑا آدمی ہمارے آنگن میں آیا اور ایسے ہی بلا سلام وکلام کے چلا گیا، آپ نے ان کو جانے کیسے دیا؟ اللہ کے بندو اتنا کرتے کہ سامنے دوکان سے ٹھنڈے کی بوتل لے کر پیش کرتے، وہ گاؤں دیہات کے آدمی تھوڑے تھے کہ ایک سانس میں گٹک لیتے، ان کو پیتے پانچ منٹ لگتی، اتنے میں، میں آجاتا فلاح دارین سے متعلق کچھ باتیں ہوتیں، دعا کی درخواست کرتے، لیکن نہیں، یہ ساری باتیں کون سمجھے.....؟ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے، پھر بعد میں جب واپس آئے تو اپنی ناراضگی کا تدارک اساتذہ کی دل جوئی سے فرمایا۔

آپ اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبہ کی نفسیات کا بھی لحاظ فرماتے، ہمارے وقت میں عصر کی نماز کے فوراً بعد کھانے سے پہلے ادعیۂ ماثورہ کے سیکھنے سکھانے کے حلقے لگتے، ایک بار حضرت رئیس حلقوں کا معاینہ کر رہے تھے، اس دوران جس طالب علم کے سر پر بڑے بال دیکھتے، اسکو کٹوانے کا حکم دیتے، حضرت رئیس کا حکم آخری حکم ہوتا، طلبہ کو بال کٹوانا ہی

پڑتے، ایسے ہی معاینہ کے دوران ایک حلقے میں پہنچے، وہاں ایک طالب علم تھے، ہماری جماعت کے صدیق پالنپوری، ان کے بال کافی بڑے تھے، ان کو کھڑا کیا، ٹوپی اتروائی، فرمانے لگے: اتنے بڑے بال رکھتے ہو، شرم نہیں آتی؟ ابھی جاؤ اور بال کٹواؤ، اس نے بے باکی سے کہا: نہیں کٹواؤں گا، حضرت رئیس گھڑی بھر سکتے میں آگئے، پوچھا کیوں بھائی؟ اس نے کہا آئندہ ہفتے میرا نکاح ہے، یہ سنتے ہی مسکرا دیے اور دل لگی کے انداز میں فرمایا: اچھا یہ بات ہے! شاید بیوی نے منع کیا ہوگا کہ اگر بال چھوٹے ہوئے تو شادی نہیں ہوگی، چلو کوئی بات نہیں، آپ کو اجازت ہے، یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے، طلبہ آپ کے عفو وحلم سے واقف تھے، جب کوئی طالب علم شرارت وشکایت میں ماخوذ ہوتا اور اخراج ہوتا، تو وہ طالبِ علم دو تین دن تک مدرسے ہی میں روپوش رہتا، تیسرے دن ایسی ترکیب اپناتا کہ جیسے ہی حضرت رئیس مدرسہ میں داخل ہوتے یہ ان کے سامنے ہی مدرسہ سے باہر نکلتا، حضرت رئیس آواز دیتے کہ اس وقت کہاں جارہے ہو؟ وہ کہتا آپ نے میرا اخراج کردیا ہے، اس لیے گھر جارہا ہوں، حضرت رئیس فرماتے: بڑے آئے، اخراج والے، چلو جاؤ درس گاہ میں، سبق میں بیٹھو یہ کہہ کر معاف فرمادیتے اور اخراج رد ہوجاتا۔

میں اور میرے رئیس محترم، لفظ "میں" کا استعمال اکھرتا ہے، بندہ ناچیز، ناکارہ، حقیر، فقیر، عاصی، لفظوں کی ایک طویل فہرست ہے، پر اپنے دل کا کیا کروں، جو عقیدت و محبت کے دام کا اسیر ہے، اس کو دعویٰ ہے ایسی شخصیت سے قرب وقرابت کا اور رفق ورفاقت کا، جو ادب وسلیقہ، وقار وشائستگی، نظافت و پاکیزگی، تمیز وحسن انتخاب، ترتیب وتنظیم، لطافت احساس وحسن ذوق، عالی ظرفی اور شرافت طبع، ہمدردی اور خیر خواہی، نرم خوئی اور شیریں کلامی، تواضع وانکساری وایثار وقربانی، بے غرضی اور خلوص، استقلال و پامردی، فرض

شناسی اور مستعدی، خدا ترسی اور پرہیز گاری، توکل اور جرأت اقدام، جس کی زندگی کے وہ دل کش خدوخال ہیں، جن کی بدولت اس میں غیر معمولی کشش اور اتھاہ جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے اور بے اختیار دل اس کی طرف کھینچنے لگتا ہے، تو میں اور میرے میں جو چاشنی دیکھی، اس کی مراد میں وہ ناکافی لگے، اس لیے مجبوراً "میں اور میرے" کا انتخاب کرنا پڑا۔

1977 کی بات ہے میں اپنے والد مرحوم اور مشفق استاذ کی ہمراہی میں فلاح دارین میں داخل ہوا، میرے مکتب کے استاذ حضرت مولانا عبداللہ صاحب بالاکاویؒ تھے، جو اولین فلاحی فضلاء میں سے تھے، حضرت رئیس کے شاگرد اور حضرت مولانا ذوالفقار صاحب مرحوم کے خادم خاص تھے۔ ادھر حضرت مولانا عبدالرشید صاحب سے ہمارے دیرینہ گھریلو تعلقات تھے، میرے استاذ مرحوم اور مولانا عبدالرشید صاحب کی وجہ سے حضرت رئیس اور مولانا ذوالفقار صاحب ہمارے دینی حالات سے قدرے واقف تھے، ہمارا تعلق فرقۂ مہدویہ سے تھا، ہمارا رہن سہن مبتدعین میں تھا، ہماری پوری قوم ضروریات دین تو بہت بڑی بات ہے، اکثریت قرآن کی ابجد سے بھی ناواقف تھی، محلے کا حال بھی قریب قریب یہی تھا، ان حالات نے مذکورہ دو بزرگوں کی نگاہ میں میری طالب علمانہ وقعت کو بڑھا دیا تھا۔ مزید برآں حضرت مولانا عبدالرشید صاحب کی معیت میں ان دونوں حضرات کی ہمارے گھر آمد اور والد صاحب سے ملاقات، ان کے دینی جذبے اور حوصلے سے واقفیت نے مزید تقویت بخشی، شروع سے ہی میری اردو زبان کلاس کے اور طلبہ سے کافی پختہ تھی، اس کا فائدہ یہ ہوا کے ابھی داخلے کو ایک مہینہ ہی بیتا تھا کہ انجمن اصلاح الکلام کے افتتاحی جلسے میں حضرت مولانا ذوالفقار صاحب نے ایک تقریر یاد اور مشق کرا کے تقریر کے لیے کھڑا کر دیا، پھر تو یہ سلسلہ فراغت تک جاری رہا، دوسری طرف غالباً میرا فارسی اول یا

دوم کا سال تھا، حضرت رئیس کی جس وقت ہمارے گھر آمد ہوئی گھر میں ایک تختہ ٹنگا ہوا تھا، جس پر مہدویت کی تسبیح لکھی ہوئی تھی، جو والد صاحب کے یومیہ معمولات میں سے تھی، مہدویت کے تین ارکان ہیں: خودساختہ جعلی پیروں کی مریدی، قبر پرستی اور رات کو سوتے وقت مہدوی تسبیح کا ورد- تسبیح کے کلمات تھے: لا إله إلا الله محمد رسول الله، الله إلٰهنا، محمد نبينا، القرآن والمهدي إمامنا، آمنا وصدقنا جیسے ہی حضرت رئیس کی نگاہ اس تختے پر پڑی، آپ نے حضرت علی میاںؒ کی مشہور زمانہ تصنیف دعوت وعزیمت میں مذکور تحریک مہدویت کا تذکرہ کیا، بالآخر حضرت رئیس کے سمجھانے سے سب سے پہلے ہمارے گھر سے اس تختے کا انخلاء ہوا اور صحیح عقیدے کی بنیاد پڑی، ان وجوہ کی بنیاد پر ہمیشہ آپ کی الطاف و عنایات میرے شامل حال رہی، باقی میری اپنی حرکات ایسی رہیں کہ آپ کی جگہ کوئی اور مہتمم ہوتا تو شاید مولوی بن پانا ایک خواب ہوتا، آپ ہر حرکت پر درگزر فرماتے، اکثر اوقات اکیلے میں جب ملاقات ہوتی، تو فرماتے آپ کا یہاں رہنا اور ہمارا آپ کو پڑھانا آپ کی قوم کے مستقبل کے لیے بہت ضروری ہے، لیکن میں کیا کرتا، طبیعت کی آزادی، مزاج کا اکھڑپن اور شرارتی چال چلن ہمیشہ آڑ بنا رہا اور موقع غنیمت گنواتا رہا، باقی تو نامور فلاحیوں میں میرا بھی شمار ہو جاتا۔

ویسے فلاح دارین کی مسند اہتمام کانٹوں بھری سیج سے کم نہیں، بھاری بھرکم علمی شخصیات، قدوسی صفات کی حامل ہستیاں، باادب، ذہین اور محنتی طلبہ کی کثرت، جہاں فلاح دارین کی ناموری ومقبولیت میں چار چاند لگاتی ہے، وہیں خارجی عوامل کی تنگ نظری اور کوتاہ فہمی داغداری میں مستعد نظر آتی ہے۔ اگر حضرت رئیس مرحوم کی ذات صبر وثبات استقلال، علوہمتی، عزم وحوصلے کی پختگی اور نصرت خداوندی سے لیس نہ ہوتو دنیائے علم وعرفان افکار

عالیہ سے متصف شخصیت سے محروم ہوتی، کئی ایسے مواقع آئے جہاں حضرت رئیس نے مستعفی ہونے کا من بنایا، لیکن حضرت علی میاں کی دور اندیشی، حوصلہ افزائی اور خدائی ڈر نے یاوری کی اور آپ کو مسند اہتمام پر جمائے رکھا، لیکن جب کوتاہ بینوں کی شامت وشقاوت حضرت رئیس سے عدول کرتے ہوئے آپ کے اہل خانہ تک جا پہنچی، تو مجھے برابر یاد ہے مدرسے کی بیت الخلاء اور غسل خانے کی اندرونی دیواروں کو حضرت رئیس اور آپ کے اہل خانہ کی دل سوزی میں حیا سوز تحریر کے لیے تختۂ مشق بنایا گیا تھا، آپ کے صاحب زادے حافظ ابراہیم اور حافظ قاسم ہمارے دوست تھے، ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایسی تحریر پر ان کی نظر پڑے، دوپہر میں جب طلبہ محو خواب ہوتے اور عصر کے بعد جب طلبہ تفریح کے لیے جاتے، تو میں اور میرے ساتھی مولوی حنیف رویدروی اور مولوی بشیر خلجی ایک ایک بیت الخلاء اور غسل خانے کو چیک کرتے اور تحریر شدہ ہفوات کو مٹاتے اور کسی کو خبر نہ ہوتی۔

ہمارا ہدایہ کا سال تھا، آخر ایک دن حضرت رئیس اور آپ کے اہل خانہ کا پیمانہ صبر سے لبریز ہو گیا اور آپ نے مع اہل خانہ ساکن وصامت اپنے وطن کاپودرہ کی راہ لی، فلاح دارین میں دن بھر سناٹا چھایا رہا، کوئی کچھ بولنے کو تیار نہیں تھا، جیسے تیسے دن رات بیتے دوسرے دن دوپہر کو دورہ، مشکوۃ اور ہدایہ کے طلبہ کی میٹنگ ہوئی، اس میں یہ طے پایا کہ ہمیں ہر صورت میں حضرت رئیس کو واپس فلاح دارین لانا ہے، سواری کا نظم کیا گیا اور جیسے ہی چار بجے، تینوں جماعت کے چیدہ طلبہ کاپودرہ کی لیے نکل پڑے، جب ہم کاپودرہ پہنچے، تو عصر کی جماعت کھڑی ہو چکی تھی، ہم سب جماعت میں شریک ہو گئے، حضرت رئیس بھی موجود تھے، جیسے ہی سلام پھیرا، طلبہ کی کثیر تعداد کو دیکھ کر چونک پڑے، نماز کے بعد وہیں

ڈیرہ جمایا، تمام طلبہ آپ کے اردگرد بیٹھ گئے، خوب بات چیت ہوئی، منت سماجت کی گئی، لیکن ایک کے دو نہ ہوئے، میں حضرت سے سٹ کر بیٹھا ہوا تھا، جب کوئی کاری نہ چلی، تو اتفاقاً ایک جملہ میرے منہ سے نکلا کہ باجی! اگر آپ فلاح دارین میں واپسی کے لیے راضی نہیں ہوتے، تو ہم حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا دور زندہ کر دیں گے، ہم بھی یہیں رہیں گے، باقی طلبہ کو بھی بلا لیں گے اور فلاح دارین چھوڑ دیں گے، یہ سنتے ہی حضرت رئیس پر سکتہ طاری ہوا، کچھ دیر ہمیں تکتے رہے، آپ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے، پھر آنسو پیتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فرمانے لگے: میاں جمبوسری! اگر میں فلاح دارین میں آ بھی گیا تو مہمان خانے میں رہوں گا۔ (اس وقت مہمان خانہ بورڈنگ میں تھا) اور سب سے زیادہ پریشانی آپ کو ہوگی، سب نے بیک زبان کہا: کوئی بات نہیں، بس آپ فلاح دارین تشریف لے آیئے، بالآخر حضرت رئیس راضی ہو گئے اور کچھ ہی دنوں میں فلاح دارین تشریف لے آئے فللہ الحمد والمنہ۔

کچھ یادیں کچھ باتیں:

جمعہ کا دن تھا، ہم کمرے کی صفائی کر کے سستا ہی رہے تھے کہ حافظ ابراہیم کی آمد ہوئی، وہ کہنے لگے: ہمارے گھر چلو، گھر میں باجی اور چھوٹی بہن اکیلی ہے، باجی کی طبیعت ناساز ہے اور بدن درد کی بھی شکایت ہے، میں، مولوی حنیف رویدروی اور مولوی بشیر خلجی ایک ساتھ حضرت رئیس کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ بستر پر لیٹے ہوئے تھے، ہم قریب بیٹھ گئے، جیسے ہی آپ نے ہمیں دیکھا، رات اماں جی سے ہوئی میٹھی نوک جھونک کی کہانی سنانے لگے: کل عِشا کی نماز کے بعد اِنگار محلے میں حضرت مولانا ذوالفقار صاحب کا

بیان تھا، ابراہیم کی والدہ کہنے لگی: میں بچیوں کو لے کر مولانا کے بیان میں جارہی ہوں، میں نے کہا: بچیوں کو بھیج دو، آپ یہیں رہو، میری طبیعت کچھ ناساز ہے، کہنے لگی: یہ تو آپ کا ہر وقت کا رونا ہے، آپ آرام کرو، میں تو جارہی ہوں، میں نے کہا: یہ مولانا کا بیان ہے، کچھ تو ہمارے پلے بھی نہیں پڑتا، آپ کیا سمجھو گی؟ کہنے لگی: ہمیں تو سمجھ میں آتا ہے، یہ کہہ کر چلی گئی، جب سب بیان سے واپس آئے، میں نے ان سے پوچھا: بتاؤ مولانا نے کیا کہا؟ کہنے لگی: بہت کچھ کہا، آپ کو اس سے کیا مطلب؟ یہ کہہ کر آپ مسکرانے لگے اور مولانا ذوالفقار صاحب کے بارے میں فرمانے لگے: مولانا تو مولانا ہیں، بھلا ان کی باتوں کو سمجھنا کوئی آسان بات ہے؟

لگے ہاتھ ایک قصہ مولانا کا ذکر کرتا چلوں۔ حضرت مولانا ذوالفقار صاحبؒ کا مکان پہلے بازار میں واقع ''بناچیری ٹریبل ٹرسٹ'' کی بالائی منزل پر تھا، مکان سے چند قدم فاصلے پر ایک ہندو طبیب کا مطب تھا، مطب سے ملحق ہی اس کا مکان تھا، مولانا کی اس سے یاری تھی، ایک اور جناب تھے سلیمان لمباڈا، اکثر شام کے وقت یہ تینوں ایک ساتھ تفریح کے لیے نکلتے، ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی تھا، ایک دن طبیب کو دل کا دورہ پڑا اور وہ مرگیا، ابھی اس کی نعش گھر میں ہی تھی کہ حضرت مولانا اپنے ہم عمر چند رفقاء کے ساتھ اس کے اہل خانہ کی دل جوئی کے لیے پہنچے، پہلے سے جان پہچان تھی، گھر والے دوستی سے واقف تھے، مولانا کی برکت سے اسلام سے بھی واقفیت تھی، گھر کی عورتوں نے درخواست کی کہ ان کی آتما کی شانتی کے لیے کچھ قرآن کی تلاوت کرلیں، مولانا نے حامی بھرلی اور تلاوت کے لیے تیار ہوگئے، آپ کے رفقاء پیچھے سے آپ کا کرتہ کھینچتے ہوئے آپ کو اشاروں سے منع کرنے لگے، لیکن آپ نے زبانی تلاوت شروع کردی اور ایک ہی

آیت بار بار دوہرانے لگے، کچھ دیر کے بعد وہاں سے باہر نکل آئے، جیسے ہی باہر نکلے آپ کے رفقاء آپ کے سر ہو لیے، کہنے لگے: ہم نے آپ کو متنبہ کیا، لیکن آپ رکے ہی نہیں، وہ تو کافر تھا، آپ نے تلاوت کیسے کر لی، مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا: پہلے یہ تو جانو کے میں نے کیا پڑھا، میں نے ایک چھوٹی سی آیت بار بار پڑھی، وہ آیت تھی: **وسیق الذین کفروا الی جھنم زمراً الخ**..... جس میں جہنم کی سزا کا ذکر ہے، یہ سن کر آپ کے سارے رفقاء کہنے لگے: مولانا آپ کو سمجھ پانا ہمارے بس کی بات نہیں، یہ تھے ہمارے حضرت مولانا ذوالفقار صاحب۔ طاب اللہ ثراہ۔

آمدم برسرِ مطلب:

خیر ہم حضرت رئیس کی خدمت میں لگ گئے، ابھی کچھ ہی وقفہ گزرا تھا کہ کیچن سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی، بھائی ابراہیم کیچن میں گئے، واپس پلٹے تو آپ کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی، جس میں سنترے کی کاشیں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں، وہ لاکر ہمارے سامنے رکھ دیں، حضرت رئیس نے فرمایا: لو پہلے کھالو، ہم نے ایک ایک قاش اٹھائی اور سیدھے منہ میں رکھ دی، آپ ہمیں کچھ دیر دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے اور دھیرے دھیرے منھ چلا رہے تھے، پھر فرمانے لگے: آپ دیہات کے ہو اور دیہات ہی کے رہو گے، پھر پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ایک چھوٹی سی بچی کی سلیقہ مندی دیکھو اور ایک آپ ہو کہ کھانے کا سلیقہ معلوم نہیں، پھر آپ نے ایک قاش اٹھائی، اس کو درمیان سے کھولا، اسکا گودا منہ میں رکھا اور اس کا جھلی دار چھلکا ایک طرف رکھ دیا، پھر فرمایا: یہ ہے کھانے کا طریقہ!

حضرت رئیس مرحوم سے ہمارا رشتہ صرف استاذ و شاگرد کا ہی نہیں، بلکہ مربی و مربیٰ اور اس سے آگے محب و محبوب کا بھی تھا، فراغت کے بعد تو اور جلا ملی اور یہ رشتہ رفاقت و اپنائیت میں تبدیل ہو گیا اور اس کی ہمواری میں سب سے اہم کردار ادا کیا حضرت رئیس کے بھتیجے اور میرے ساتھی حافظ سراج صاحب اور میرے ہمدم و غم گسار، رفیق درس، حضرت مولانا فاروق صاحب بڑودوی نے، جنہوں نے حضرت رئیس سے ہمہ وقتی ملاقاتوں میں میرے تذکرے کو زندہ رکھا۔ یہ میری خوش بختی رہی کہ ہر وقت و ہر آن حکیم برادران نے ایک فرد خانہ کی طرح میرا ساتھ دیا، بلکہ آگے بڑھایا۔ جہاں حضرت مولانا فاروق صاحب نے ہمارے ہر استاذ سے تعلق کی ڈور کو مضبوط کیا، وہیں ان کے چھوٹے بھائی مفتی عارف صاحب نے ہر دینی کام میں مجھے پیش پیش رکھا، میرا دینی کام میری قوم محلہ اور شہر تک محدود تھا، لیکن انہوں نے بڑودہ میں ہر جگہ مجھ سے بیانات کروائے، یہاں تک کہ دار العلوم تاندلجہ تک میں مجھے کھڑا کر دیا، جو میری حیثیت سے ورے تھا، اللہ پاک ان جمیع حضرات کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

فراغت کے بعد میں اپنی دنیا میں مگن تھا، تجارت کا پیشہ تھا، پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ عقائد حقہ اور صحیح اسلامی تعلیمات کو لے کر قوم و محلہ اور اہل شہر کی ذہن سازی میرا محبوب مشغلہ تھا، لیکن پھر بھی مدارس کی دنیا سے کٹا ہوا تھا، وہ تو اللہ بھلا کرے ہمارے حضرت مولانا مفتی احمد صاحب دیولہ دامت برکاتہم کا کہ انہوں نے ہمارے شہر میں جامعہ علوم القرآن کو قائم کیا، جس کی برکت سے عالی مرتبت دینی شخصیات سے ملاقات و محبت کا رشتہ قائم ہوا، حضرت مفتی صاحب کا ہمارے حضرت رئیس سے گہرا ربط و تعلق تھا، حضرت رئیس کی نگاہ میں جامعہ علوم القرآن کی اتنی ہی وقعت تھی، جتنی فلاح دارین اور جامعہ کھروڈ کی۔ حضرت بار بار

جامعہ میں تشریف لاتے، انتظام وتعلیم سے لے کر طلبہ کی تربیت تک اور جامعہ کے مدرسین کی رہنمائی تک میں گہری دلچسپی دکھاتے، میری قسمت اس وقت ناز کر اٹھتی، جب حضرت رئیس جامعہ میں تشریف لاتے اور فون کر کے مجھے بلاتے اور فرماتے: آپ کو دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور راحت کا احساس بھی۔ جب کسی نئی جگہ جاتا ہوں تو مزاج سے واقف کار کی موجودگی راحت کا سبب بنتی ہے اور ڈھارس کا بھی، چند سال پہلے ہمارے جامعہ علوم القرآن میں "رابطہ ادب اسلامی" کی ماتحتی میں علامہ طاہر پٹنیؒ کی دینی وعلمی خدمات کے عنوان پر ایک سیمینار رہوا تھا، ملک بھر سے علماء کی آمد تھی، حضرت رئیس اپنے صاحب زادے مولانا اسمٰعیل صاحب کے ساتھ تشریف فرما تھے، ترکیسر سے حضرت مولانا ذوالفقا صاحب مولانا عبدالرشید صاحب اور مولانا اقبال صاحب بھی تشریف فرما تھے، جیسے ہی حضرت رئیس تشریف لائے، مجھے بلایا اور فرمایا: مجھے تین دن یہاں رکنا ہے، ان تین دنوں میں اپنے گھر سے کھانے کا نظم تجھ کو کرنا ہے، یہ سن کر میری تو قسمت جاگ اٹھی، میں خوشی سے پھولے جا رہا تھا، بلکہ ہوا میں اڑ رہا تھا، خوب خدمت کا موقع ملا، تین دن ایسے بیتے جیسے تین پل، ہمارے سارے اساتذہ کے لیے گھر سے کھانا لاتا، سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور دعاؤں سے نوازتے۔

فراغت کے بعد جب بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوتا، تو حضرت رئیس اشیاءِ خوردنی کا نرخ دریافت فرماتے، میں جواب دیتا، لیکن بار بار کی دریافتگی پر اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں مجھے تعلیم وتعلم سے بھٹکا ہوا، دنیا پرست خیال نہ فرمالیں، اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی کہ حضرت رئیس کی موجودگی میں کاپودرہ ہی میں جمعہ کے دن بیان کے لیے کھڑا ہو جاؤں، کھروڈ سے مولانا ایوب پانولی صاحب اور دیگر ساتھیوں کی معیت

میں کاپودرا پہنچا، جمعہ سے پہلے حضرت کے بھانجے حافظ اسلم کے یہاں ہماری دعوت تھی، دعوت سے پہلے حافظ سراج و حافظ سلیم مرحوم کی معرفت مسجد کے ذمہ داران سے بیان کی اجازت لے لی اور جمعہ میں بیان کے لیے کھڑا ہو گیا، خدا کا شکر ہے کہ حضرت رئیس بیان سے خوب محظوظ ہوئے، گلے لگایا، سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا، اور رخصتی کے وقت تین چار کتابیں عنایت فرمائیں۔ پھر تو یہ رت بن گئی کہ جب بھی کاپودرا جاتا کوئی نہ کوئی کتاب عنایت فرماتے، دل چسپ بات یہ رہی کہ بعد میں حافظ سراج نے یہ ساری کہانی حضرت رئیس کو بتادی، یہ سن کر حضرت رئیس بہت ہنسے۔

ابھی دو تین سال پہلے حضرت رئیس کے گھٹنوں میں درد اتر آیا، درد میں تیزی تھی گھر کے سامنے کی مسجد میں جانا بھی دوبھر ہو گیا، عصر بعد کی مجلس بھی موقوف کردی، زائرین سے ملاقاتیں بھی کم کردی تھیں اور بستر سے لگ گئے تھے، اللہ کے فضل سے میں نے اپنے یہاں فلاحی فائن ٹچ کے نام سے ایک مکتب قائم کیا ہے، جس میں دوسوبیس کے قریب بچے اور بچیاں زیر تعلیم ہیں، ہم ہر سال اسکول کے طرز پر (جیسے وہ طلبہ کو سیر و سیاحت کے نام پر مٹھوں، مندروں اور آشرموں میں لے جاتے ہیں) بچوں کو مختلف دینی جامعات اور بزرگان دین کی خدمت میں حاضری کے لیے لے جاتے ہیں، عین حضرت رئیس کی بیماری کی حالت میں ٹنکاریہ کے دار البنات اور دار العلوم کی سیر اور حضرت رئیس سے بچوں کی ملاقات کا پروگرام بنایا، اب اس کے لیے حضرت رئیس کی اجازت ضروری تھی، اجازت کے لیے مولانا اسمٰعیل صاحب کو فون کیا کہ ہم عصر کے بعد اپنے مکتب کے ساٹھ بچوں کے ہمراہ والد صاحب سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، مولانا اسمٰعیل صاحب نے پہلے تو منع کر دیا، ہم منت سماجت کرنے لگے، حضرت رئیس فون پر ہو رہی بات پر کان لگائے ہوئے تھے، بالآخر

حضرت رئیس نے فرمایا: کون ہے؟ کس سے بات ہورہی ہے؟ جواب میں مولانا اسمٰعیل صاحب نے فرمایا: جمبوسری ہے، مکتب کے ساٹھ بچوں کے ساتھ کل عصر بعد آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے، یہ سنتے ہی حضرت رئیس نے فرمایا: اس کو منع مت کرو، آنے دو، وہ بچوں کے پیچھے بہت محنت کرتا ہے، محبت کے ساتھ آتا ہے، اگر منع کروگے تو اس کا دل ٹوٹے گا اور پھر ہمیں اجازت مل گئی۔ اندازہ لگائیں، اپنے وقت کی بارعب، قدآور اور عظیم المرتبت شخصیت جس کا آنگن ہمیشہ علماء، صلحاء اور طلبہ سے ہرا بھرا رہتا ہو، وہ اپنی عین بیماری کے عالم میں ایک بے بضاعت، کم مایہ، بے حیثیت اور ناکارہ کے دینی جذبات کا اتنا قدردان ہو، کیا کوئی دوسرا ہے جس کے لیے ہم اپنی پلکے بچھائیں، اپنا سب کچھ نچھاور کردیں خیر! جب دوسرا دن ہوا، ہم اپنے مکتب کے ساتھی مدرسین کے ہمراہ ٹنکاریہ ہوتے ہوئے، عصر کے بعد بچوں کو لے کر حاضر خدمت ہوئے، تو مجھے اپنے قریب بٹھایا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب اور ہمارے مکتب کے مدرسین مولانا شکیل فلاحی، مولانا اقبال فلاحی اور مولانا سلمان فلاحی نے بچوں کو قطار میں کھڑا کردیا، بچے بچیاں باری باری آتے، حضرت رئیس ہر ایک سے مصافحہ کرتے، سر پر ہاتھ پھیرتے اور دعا دیتے، صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ اپنے کمرے سے ہوتے ہوئے کیچن کے راستے سے سب بچوں کو باغیچے میں بٹھایا، جہاں عصر کے بعد مجلس ہوتی تھی، اللہ جزائے خیر سے نوازے مولانا اسماعیل صاحب کو، جو انتظام وانصرام میں حضرت رئیس کے نقش ثانی ہیں، ہر بچے کے لیے ناشتے کی پلیٹ اور ہر ایک کے لیے ایک بڑا شربت کا گلاس تیار کیا ہوا تھا، بچوں کو تعلیم ونصیحت کے لیے مولانا فاروق صاحب کا پودروی کو حاضر رکھا تھا، بڑی خوب رہی یہ ملاقات وزیارت، آج بھی جب یہ منظر آنکھوں میں گھومتا ہے، دل بے قابو، آنکھیں اشک بار اور طبیعت میں محبت کے جذبات کا ایسا وفور کہ

سامنے حضرت رئیس کھڑے ہوں اور ہم دور سے آپ کو دیکھتے ہی آپ سے چمٹنے کے لیے اس حقیقی بچے کی طرح دوڑ لگائیں، جو برسوں بعد اپنے والد کو دیکھ کر بے قراری میں اس سے گلے ملنے کو دوڑ لگاتا ہے۔

اور اسی پر بس نہیں، جب بھی کسی حادثے کا شکار ہوتا، آپ فون پر دل جوئی فرماتے اور اپنے اہل خانہ میں سے کسی نہ کسی کو عیادت کے لیے بھیجتے، آپ کو شاید تعجب ہو، عین مرض الوفات میں جب آپ کی اولاد آپ کی راحت رسانی میں دن رات ایک کیے ہوتی، چاہے وہ برطانیہ سے آئی ہو یا کناڈا سے، میرے پاس ضرور بھیجتے، پھر چاہے وہ یونس بھائی ہوں یا یوسف بھائی، حافظ ابراہیم ہوں یا حافظ قاسم ہوں، آپ کے پوتے ہوں یا نواسے، سب باری باری جمبوسر تشریف لاتے اور مزاج پرسی کرتے، یہی وہ ربط و تعلق تھا، رشتہ تھا، ناطہ تھا، جو اس حد تک جڑ پکڑتا گیا کہ جب حضرت رئیس سے مخاطب ہونے کا موقع ملتا، تو مولانا اور حضرت سے نہیں بلکہ باجی سے ہوتا۔ یہ تھی حضرت رئیس سے میرے تعلق کی انتہا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب آپ کا سراپا وجود تصور میں متصور ہوتا ہے، تو آپ کے جملہ صفات و کمالات، آپ کی جودتِ طبع، آپ کی وسعتِ ظرفی، آپ کے اخلاق عالیہ اور کمتر کو بہتر بنانے کی ٹیکنک، زندگی میں وہ رنگ بھرتی ہے، جو ایک بنجر زمین، غلط معاشرے اور بے دینی میں پلنے والے کی زندگی کو رنگین بناتے ہوئے حقانیت و انسانیت کے اس جھروکے میں کھڑا کر دیتی ہے، جہاں اپنائیت کے سوا کوئی دوسرا رشتہ سمجھ میں نہیں آتا، پھر چاہے کوئی اس کو مبالغہ سمجھے یا غلو۔ حضرت رئیس کل بھی ہمارے تھے، آج بھی ہمارے ہیں اور ان شاءاللہ کل قیامت میں بھی ہمارے ہی رہیں گے۔

ایک دلچسپ واقعہ:

ایک دن میں اپنی دکان پر بیٹھا ہوا تھا، گھڑی صبح کے نو بجا رہی تھی، میرے سامنے یکا یک ایک گاڑی آ کر رکتی ہے، میں نے نظر اٹھائی، دیکھا تو حیرت واستعجاب میں ڈوبا ہوا، پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا، گاڑی کے قریب پہنچا، کیوں کہ اس میں حضرت رئیس براجمان تھے، گاڑی کا دروازہ کھول کر حضرت رئیس کو اپنے ساتھ دکان میں لے آیا اور ماسٹر کرسی میں بٹھا دیا، وہ بھی عجیب گھڑی تھی، صبح کا وقت تھا، گاہکوں کی آمد آمد تھی، میں گاہکوں کو سامان دیتا اور حضرت رئیس قیمت وصول فرماتے، یہ بھی تعلق کا ایک پہلو تھا، جس میں اپنا پن جھلکتا تھا۔ پتہ نہیں ایسا کیا ہے، میری زندگی میں، جو ہمہ وقت حادثوں سے دوچار رہتی ہے، سات یا آٹھ میجر آپریشن ہو چکے ہیں، فی الحال بھی ووکر کے سہارے ہوں، اگر اسکو کسی عنوان سے معنون کرنا ہو تو سب سے بہتر جملہ وہ جملہ ہوسکتا ہے، جو حضرت رئیس المحدثینؒ کی لسان عالی شان سے نکلا تھا، وہ جملہ ہے: ''ہر چہ بلا از آسماں آید پرسید کہ خانۂ انوری کجا است''۔

ایک مرتبہ فلاح دارین میں تھا، عشاء سے پہلے مولانا نذیر صاحب کھانا کھلانے کے لیے اسٹیشن پر واقع ایک چائنیز ریسٹورنٹ لے گئے، اچھے سے کھانا کھایا، پھر پتہ نہیں، ایسا کیا ہوا، کسی جن کی حرکت تھی یا اپنا بے تکا پن کہ کرسی سمیت زمین سے جا لگا اور داہنے ہاتھ کی کلائی کے اوپر کی ہڈی توڑ بیٹھا، مولانا گھبرائے اور رات ہی میں فی الفور نرولی ہوتے ہوئے کامریج ہسپتال میں داخل کر دیا اور رات بھر میرے ساتھ رہے، دوسرے دن آپریشن ہوا، اسی اثناء میں حضرت رئیس کی فلاح دارین میں تشریف آوری ہوئی، یہاں پتہ چلا کہ جمبوسری کامریج ہسپتال میں زیر علاج ہے، واپسی میں آپ فلاح دارین سے سیدھے

کامرتیج ہسپتال میری عیادت ومزاج پرسی کے لیے تشریف لائے اور آدھا گھنٹہ میرے پاس بتایا۔

جود وسخا اور فیاضی یہ وہ صفات ہیں، جب یہ کسی صاحب اقدار میں پائی جاتی ہیں، تو اس کے مجد ومرتبے اور مقبولیت و ہر دل عزیزی میں چار چاند لگا دیتی ہیں، حضرت رئیس مرحوم میں یہ صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، پھر چاہے آپ کا دور اہتمام رہا ہو یا اہتمام کے بعد کا دور۔ آپ کے دور اہتمام میں ہم نے دیکھا کہ آپ کے یہاں مسلسل مہمانوں کی آمد رہتی، میں پہلے بھی یہ تحریر کر چکا ہوں کہ جامعہ کا اہتمام کسی امر مشکل سے کم نہیں، جب ہم میں کچھ سمجھ آئی تب پتہ چلا کہ مہتمم کی تنخواہ میں اور مدرسین کے مقابلے میں دوسو روپے کی بڑھوتری ہوتی، مگر ساتھ میں ایک قلم بھی بڑھا دی جاتی کہ مہمانوں کی خاطر داری کی ذمہ داری مہتمم کے سر ہوتی، لیکن اس کے باوجود مالی پریشانی کا شکوہ کبھی زبان پر نہ آیا، مہمانوں کی وقت بے وقت کی آمد، مزید برآں آپ کا فیاضانہ مزاج، یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی مہتمم یا مربی کا خلاف اصول امر کے صدور پر ناراضگی اور غصہ طبیعت کا لازمہ ہے۔ حضرت رئیس کو جو خوبی دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ تھی کہ جب کبھی آپ کسی کی نازیبا حرکت پر ناراض ہوتے اور بطور سزا کہ پٹائی یا کوئی سخت بات کہہ دیتے، تو دوسرے دن اس کا تدارک فرما لیتے، چھوٹا بچہ ہوتا تو سب کے سامنے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتے، اور اگر کوئی طالب علم جوان یا باریش ہوتا تو اس کے ساتھ دل لگی کی باتیں کرتے اور اس کو خوش کر دیتے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ جب باریش طلبہ کی پٹائی ہوتی یا کوئی سخت سست کلمہ کہہ دیتے تو دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد اپنے پاس بٹھاتے اور جب سب طلبہ چائے کے لیے جاتے، تو ان کا ہاتھ پکڑ کر دل لگی کی

باتیں کرتے ہوئے، اپنے گھر ناشتے کے لیے لے جاتے، آپ کی یہی خوبی باغی بننے کے بجائے آپ کا گرویدہ بنادیتی اور فراغت کے بعد بھی یہ گرویدگی کا عالم برقرار رہتا۔

ایک دن ہماری جماعت حضرت رئیس کے دفتر میں تھی، دوران درس حقوق انسانیت پر بات چل نکلی، فرمایا: ایک دن جب میں ظہر کے بعد اپنے گھر سے نکلا، تین چار اجنبی معمر افراد کو دیکھا، دیکھنے سے محسوس ہوا کہ کسی دوسری جگ سے آئے ہوئے ہیں، میں ان کے قریب گیا، ان سے ان کی حالت دریافت کی، پتہ چلا کہ وہ کہیں اور جانا چاہتے تھے، غلطی سے ترکیسر پہنچ گئے، اب کھانے کے لیے ہوٹل کی تلاش میں تھے، گاؤں میں ہوٹل تو تھی نہیں، میں ان کو اپنے گھر لے گیا اور ان کے لیے کھانا تیار کرایا، وہ سب غیر مسلم تھے، سب نے سیر ہوکر کھانا کھایا اور کھانے کے بعد کہنے لگے: آپ انسان نہیں دیوتا ہو، بھلا انجان گاؤں میں انجانوں کو کون پوچھتا ہے؟ میں نے کہا: میں کوئی دیوتا نہیں ہوں، بلکہ ایک مسلمان ہوں، میرے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ کوئی بھی انجان آدمی اگر کسی بستی میں آجائے اور وہاں کھانے کا کوئی نظم نہ ہو اور وہ بھوکا چلا جائے، تو پوری بستی گنہ گار ہوگی اور اگر کوئی ایک اس کو کھانا کھلا دے، تو ساری بستی گنہ گار ہونے سے بچ جائے گی۔ پھر ہم سے فرمانے لگے: یہ ہے ایک مسلمان کا کام، کہ وہ غیروں کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیم کو عملی صورت میں پیش کرے۔

آپ کا گھر ہمیشہ علماء، صلحاء، علم دوست حضرات اور زائرین سے بھرا ہوا رہتا، پھر چاہے وہ صبح کا وقت ہو یا دوپہر کا یا شام کا، چائے پانی اور ناشتے سے خاطر مدارات ہوتی اور اگر کوئی بلا اطلاع کے کھانے کے وقت پہنچتا، تو حضرت رئیس واپسی پر اپنی جیب سے کھانے کا خرچ دیتے اور فرماتے: راستے میں اچھی ہوٹل دیکھ کر کھانا کھا لینا۔ علماء کی دعوت بڑی شان سے کرتے، پر تکلف اور من پسند کھانوں سے دستر خان بھرا رہتا۔ آپ جب ترکیسر

میں تھے، وہاں اگر مہمانوں کی فترت ہوتی اور لمبے وقت تک کسی مہمان کی آمد نہ ہوتی، تو مدرسے سے دو تین بڑے طلبہ کو چنتے اور ان کو دوسرے دن کھانے پر بلاتے اور گھر اماں جان سے فرماتے: کل دوپہر بڑے مہمان آنے والے ہیں، ان کی دعوت کا نظم کرنا ہے، گھر میں چہل پہل کا ماحول کھڑا ہوجاتا، حضرت رئیس دوپہر میں طلبہ کو لے کر پہنچتے، اچھے سے کھانا کھلاتے اور جب طلبہ مدرسے کے لیے واپس ہوتے، تو مزاحاً ان سے فرماتے: کہیں اس دعوت کو اپنا اعزاز مت سمجھنا، یہ تو مہمانوں کی آمد کی خانہ پوری تھی، کبھی فرماتے: جب لمبے وقت تک مہمان کی آمد نہیں ہوتی اور ایک سے کھانے سے طبیعت اوب جاتی ہے، تو طلبہ کو مہمان بتا کر اچھے کھانے کا لطف اٹھالیتا ہوں۔

مجھے برابر یاد ہے، ترکیسر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز کے بعد ترکیسر کی مقتدر شخصیات، حضرت مولانا قاری ابراہیم دیسائیؒ، حضرت مولانا غلام نورگت صاحبؒ، حضرت مولانا یوسف بھوٹیہ، ماسٹر گورا صاحب، مولانا انگار صاحب اور دیگر حضرات مسجد کے برآمدے میں جمع ہوتے، قیل وقال اور شعروشاعری کا دور شروع ہوتا، ہنسی مذاق ہوتی اور ناشتے کا بھی انتظام ہوتا، حضرت رئیس کی بھی شرکت ہوتی، وہ مجلس بڑی باذوق اور پررونق ہوتی۔

دارالاقامہ کے داخلی گیٹ پر عصر کے وقت مختلف اشیائے خوردنی کے خوانچے لگتے، طلبہ حسب استطاعت چیزیں خریدتے۔ ایک دن شام سموسے کا خونچہ لگا تھا، حضرت رئیس آئے، بیس پچیس سموسے خریدے، میں قریب میں تھا، ایک پیکیٹ بنایا اور میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فرمایا: اس کو جامع مسجد میں قاری ابراہیم صاحب کو دے آؤ، میں جب پہنچا تو مجلس معمول سے پہلے ختم ہوچکی تھی، قاری ابراہیم صاحب مین گیٹ والے زینے سے

اتر رہے تھے، دوسرے حضرات طہارت خانے والے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، جیسے ہی حضرت قاری صاحب کو پیکیٹ دیتے ہوئے کہا کہ مولانا عبداللہ صاحب نے آپ حضرات کے لیے سموسے بھیجے ہیں، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ دمکنے لگا، حضرت قاری صاحب بدن کے بھاری، پر بہت حسین وخوبصورت تھے، فورا ساتھیوں کو آواز دی کہ واپس آجاؤ، دیکھو مولانا عبداللہ صاحب نے ہمارے لیے سموسے بھیجے ہیں، سب واپس آئے اور مجلس دو بارہ جم گئی، کہنے کا حاصل حضرت رئیس اپنے دوستوں کا بھی کافی خیال فرماتے، اسی طرح اپنے اہل خاندان اور گاؤں کے غریب غرباء کا بھی بہت خیال رکھتے، رمضان کا پورا مہینہ ہر دن دو دیگ حلیم کی تیار کراتے اور پورے گاؤں میں تقسیم کراتے، آپ کی فیاضی کے چرچے ہر زبان خاص وعام پر تھے، سب آپکے لیے دعائیں کرتے۔

امریکی نزاد امریکی فوج کے تین مسلم سپاہی صابر الحق، زبیر اور ہارون تینوں دیو قامت تھے، مستعفی ہوکر فلاح دارین میں تعلیم کے لیے داخل ہوئے، اکثر طلبہ کھانے کے وقت میں جب یہ مطعم کے پاس ہوتے، ان کے اردگرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوجاتے اور ان کو تکتے رہتے، ایک مرتبہ امریکن ایمبیسی نے امریکہ سے انڈیا آئے ہوئے امریکیوں کے لیے ایک سیمینار کا انعقاد کیا، تو ان تینوں کو بھی مدعو کیا، حسب دعوت یہ تینوں امریکن ایمبیسی پہنچے، سیمینار کے بعد ان کے انڈیا میں آنے کی وجہ دریافت کی، انہوں نے بتایا کہ ہم انڈیا تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، یہ سنتے ہی سارا عملہ چونک پڑا اور ان سے کہنے لگا کہ ساری دنیا تعلیم کے لیے امریکہ آتی ہے، ایسی کیا تعلیم اور کون سا ادارہ ہے کہ آپ امریکہ چھوڑ کر یہاں آئے ہیں؟ انہوں نے فلاح دارین اور دینی تعلیم کے بارے میں بتایا، یہ سن کر وہ حیرت میں پڑ گئے۔ پھر یہ جب سیمینار سے واپس آئے، تو امریکن ایمبیسی سے

ان کے نام خط آیا، جس میں امریکی افسران نے فلاح دارین کی زیارت اور اس کی تعلیم کے بارے میں مزید معلومات کی خواہش ظاہر کی۔ یہ حضرات ایمبیسی کا خط پڑھ کر پس وپیش میں پڑ گئے، پھر آخر انہوں نے حضرت رئیس سے اس سلسلے میں بات چیت کی، حضرت رئیس نے فرمایا: کوئی بات نہیں، ان کو آنے دو، دفتر سے اجازت کے بعد امریکی طلبہ نے خط کے زریعے اجازت کی اطلاع دے دی، جواب میں ایک خط اور آیا، جس میں تاریخ، دن اور وقت کا ذکر تھا کہ ہم فلاں تاریخ کو، فلاں دن، صبح آٹھ بجے ترکیسر فلاح دارین حاضر ہوں گے۔ بالآخر طے شدہ وقت کے مطابق ایک لیڈی افسر کی سرکردگی میں ان کی گاڑی مدرسے کے مین گیٹ پر آ کر رکی، طے شدہ وقت سے پانچ منٹ پہلے وہ گیٹ پر آ چکے تھے، لیکن پھر بھی گاڑی سے باہر نہیں آئے، جیسے ہی پانچ منٹ بیتے، وہ باہر آئے حضرت رئیس ان کی وقت کی پابندی دیکھ کر کافی متأثر ہوئے، ویسے بھی حضرت رئیس وقت کی پابندی کو لے کر کافی حساس واقع ہوئے تھے، پھر حضرت رئیس نے ان کو دفتر میں بٹھایا اور فلاح دارین میں جاری اردو، فارسی، عربی اور انگریزی تعلیم کے بارے میں بتایا، یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت فلاح دارین میں ماسٹر شیخ مرحوم اور ماسٹر گورا مرحوم جو ہمارے استاذ حدیث حضرت مولانا یعقوب دیسائی صاحب طاب اللہ ثراہ کے والد بزرگ وار تھے، کی ماتحتی میں بلند معیار پر فائز تھی، فلاح دارین کی انگریزی کے آگے بڑے بڑے اسکول اور کالج کی انگریزی دم توڑتی دکھائی دیتی خیر اس کے بعد تعلیمی نصاب میں درس نظامی کے مقام ومرتبے سے بھی ان کو واقفیت بہم پہنچائی، اس کے بعد درس گاہ کا معاینہ کرایا گیا، بعد ازاں جب کھانے کا وقت ہوا سارے طلبہ مطعم میں موجود تھے، حضرت رئیس کی عدم موجودگی میں شور شرابہ ہونے لگا دریں اثناء حضرت رئیس لیڈی افسر کے ساتھ جیسے ہی مطعم میں داخل ہوئے، ایک

سناٹا چھا گیا، سوئی پڑی آواز سنائی دے ایسی خاموشی چھا گئی، لیڈی افسر یہ منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی، فوراً پوچھ بیٹھی کہ مولانا! ایسا کیا ہوا کہ آپ کے داخل ہوتے ہی طلبہ کی اتنی کثیر تعداد آپ کے ادب واحترام میں خاموش ہوگئی؟ حضرت رئیس نے جواب میں فرمایا: یہ سب ہماری اسلامی تعلیم کا اثر ہے۔ یہ سن کر وہ بولی: مولانا یہ قابل داد ہے، ہمارے یہاں اسکول کالجس کا یہ حال ہے ک جب ہمارے بچے سگریٹ پی رہے ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں اگر ان پر اساتذہ کا گزر ہوتو سگریٹ کا دھواں ان کے منہ پر چھوڑتے ہیں، ان کے اعزاز میں حضرت رئیس کے یہاں دعوت کا نظم تھا، بعدازاں یہ سب آپ کی معیت میں آپ کے گھر پہنچے، اللہ پاک نے حضرت رئیس میں یہ کمال ودیعت فرمایا تھا کہ آپ جہاں ہوتے یا جاتے یا کسی مجلس ومحفل میں شریک ہوتے، اس کی ساری کامیابی کے مرکزی نکتے کی حقدار آپ کی شخصیت قرار پاتی، آپ کی بارعب، ذی وجاہت پرنور، انسانیت نواز اور بلند اخلاق واقدار کی حامل شخصیت کا اثر ورسوخ ہی کچھ ایسا ہوتا کہ ہر کوئی آپ کا لوہا ماننے پر مجبور ہوتا، دو چار گھنٹے کی ملاقات نے امریکی وفد کو اتنا متأثر کیا کہ جاتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ اگر امریکہ تشریف لاتے ہیں، تو یہ ہمارے لیے خوش بختی ہوگی۔

پھر یہ بات آئی گئی ہوگئی، ایک بڑی مدت کے بعد حضرت رئیس میں امریکہ کی ملاقات کا داعیہ پیدا ہوا، اب امریکہ تو امریکہ ہے دنیا کی سپر پاور مادیت کی سرتاج مملکت رئیسیہ، جس میں داخلے کی شرائط اتنی سخت ہیں کہ مادیت سے تہی دامن، ٹیپ ٹاپ سے عاری، چھوٹے سے گاؤں کا باسی سادگی اور سچائی جس کا زیور ہو، ایسا انسان امریکہ جانے کی سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن ہمارے رئیس تو واقعتاً رئیس تھے، سارے شرائط درکنار، امریکہ کی ویزا کے لیے صرف پاسپورٹ اور درخواست سَب مٹ کردی، مولانا جسات جو مانگرول

کے ایک فلاحی فاضل، حضرت رئیس کے قریبی، انتہائی ذہین اور جہاں دیدہ تھے، جب ان کو یہ سب پتا چلا تو حضرت رئیس سے کہنے لگے: باجی! یہ امریکہ ہے، اکیلے پاسپورٹ کے دم پر ویزا ملنا ممکن ہی نہیں، حضرت رئیس نے مسکراتے ہوئے فرمایا: بھائی! امریکہ ہماری جان نہیں ہے، ملا تو ملا نہیں ملا تو نہیں ملا، لیکن کہتے ہیں کہ بعضے اکیلے ہوتے ہیں، پرا کیلے نہیں ہوتے، ان کی پشت پناہی میں قدرت خداوندی شامل حال ہوتی ہے۔ اب وہ امریکی افسر خاتون جو تین چار گھنٹے آپ کی صحبت میں رہی تھی، اس کا تبادلہ ہو چکا تھا، لیکن جاتے جاتے حضرت رئیس کے بارے میں اپنا ریفرنس اور ریمارک چھوڑ گئی تھی کہ یہ جب بھی امریکہ آنا چاہیں، اجازت دے دی جائے، حضرت رئیس نے چھ ماہ کے لیے ویزا کی درخواست دی تھی، امریکہ نے آپ کے پاس پورٹ پر دس سال کی ویزا کا ٹھپہ لگا دیا، جو بھی دنیا پرست یہ بات سنتا، محو حیرت رہ جاتا، مگر یہ فقیر بے نوا مسکرا دیتا۔

حضرت رئیس کی بیدار مغزی:

کل کا کوئی مؤرخ جامعات و مدارس کی ترقی اور کامرانی کی تاریخ رقم کرے گا، تو ضرور ان کے شعبۂ اہتمام کا تذکرہ جلی حرفوں میں کرے گا، جن کے ماتحت اپنے اپنے وقت میں ایسی نابغۂ روزگار شخصیات جلوہ افروز ہوئیں، جنہوں نے مدارس و جامعات کی کایا پلٹ دی اور ان کی ترقی اور کامرانی کے ایسے دیرپا اور انمٹ نقوش چھوڑے، جن کا تتبع اور پاسداری کامیابی کی علامت کہلانے کی حقدار بن گئی۔ ان ہی نابغۂ روزگار شخصیات میں ایک شخصیت حضرت رئیس کی ذات والا صفات بھی ہے، جن کے نقش پا کا اتباع کامیابی کی ضمانت سمجھا جائے گا، شعبہ اہتمام کے لیے جس بصیرت، فقاہت، بیدار مغزی، علوہمتی، دور

بینی، دور اندیشی، دل سوزی کڑھن، خوف خدا اور فکر آخرت درکار ہوتی ہے، قدرت خداوندی نے بڑی فیاضانہ شان سے آپ کو ان ساری صفات سے متصف کیا تھا۔

آپ نے اپنے طالب علمانہ دور کی ابتدا ہی میں امارت فاروقی کے اصول وضوابط کو حرز جان بنالیا تھا اور اس کی عمل داری میں ان انفاس قدسیہ کی راہ لی جنہوں نے اپنے دور اہتمام کو ایک مثالی دور میں تبدیل کر دیا تھا، جامعہ ڈابھیل کے مثالی مہتمم حضرت مولانا سعید بزرگؒ کے زیر سایہ آپ کی طالب علمانہ زندگی پروان چڑھی، وہ رنگ تو آپ میں تھا ہی، مزید برآں جامعہ حسینیہ کے مہتمم حضرت مولانا سعید صاحب کی مجاہدانہ اور جفاکشانہ خلوص و للّٰہیت کا بھی پرتو تھا، حضرت رئیس اپنے دور اہتمام میں جب بھی کٹھن حالات میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتے، اپنے پیش رو کے نقش پا کا اتباع کرتے ہوئے حالات کو سازگار بنا لیتے۔

ایک مرتبہ فلاح دارین میں طلبہ نے دوپہر کے کھانے کے وقت دیے جانے والے دال چاول کے بدمزہ ہونے کی شکایت کے ساتھ انتہائی غم و غصے کے عالم میں کھانے کا بائیکاٹ کر دیا، اتفاقاً اس دن حضرت رئیس مطعم میں موجود نہیں تھے، طلبہ شور کرنے لگے، تو ٹیبل والے گھبرائے، حضرت رئیس کو بلانے کے لیے آدمی دوڑایا، کچھ ہی دیر میں حضرت رئیس آموجود ہوئے، حضرت رئیس کو آتا دیکھ طلبہ خاموش ہو گئے، حضرت رئیس نے طلبہ کی حرکت پر کوئی سرزنش نہیں کی، البتہ کچھ طلبہ کو ٹیبل پر بلایا اور نہایت اطمینان سے فرمایا: بھائی آپ لوگوں کو کیا پریشانی ہے؟ کھانے کے باب میں کیا شکایت ہے؟ ایک طالب علم نے دال کا پیالا اٹھا کر حضرت رئیس کے سامنے رکھ دیا اور فریاد کرنے لگا کہ مولانا! یہ دال اتنی پتلی ہے کہ چاول بھی اس کو جذب نہیں کر پاتے اور جیسے ہی دال چاول میں ڈالتے ہیں، اس کا

پانی پورے خوانچے میں گشت کرنے لگتا ہے، پھر بھی حضرت رئیس خاموش رہے، مطعم میں ہو کا عالم تھا، حضرت رئیس دال کا پیالا لے کر مطعم میں داخل ہوئے اور طلبہ کے سامنے پیالا اپنے منہ سے لگا لیا، آپ دال پیتے جاتے اور الحمدللہ کہتے جاتے، دال ختم ہونے پر فرمایا: دل چاہتا ہے کہ ابھی اور دال کا مزہ لوں، اپنے اسلاف کو یاد کروں، جنہوں نے بھوکے رہ کر علم حاصل کیا، بھوک برداشت سے باہر ہوئی تو کچرے کے ڈھیر سے پتیاں اٹھا کر کھائیں، جنگل سے لکڑیاں لاتے چولہا کرتے، اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ ہمیں ایسے مجاہدے سے بچا لیا، یہ سنتے ہی طلبہ کی گردنیں جھک گئیں اور سب کھانا کھانے لگے، پھر عصر کی نماز کے بعد وعظ و نصیحت کے لیے طلبہ میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا سعید صاحبؒ کے زمانے میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، وہاں بھی دال ہی کی شکایت تھی، میں نے تو ایک پیالا ختم کیا، حضرت مولانا نے تین تین پیالے ختم کیے، اس کے بعد واقعات کی جھڑی لگا دی اور طلبہ کو ہلکا پھلکا کر دیا۔ الحمدللہ! اس کے بعد پھر کبھی ایسی نوبت نہیں آئی۔

حضرت رئیس کے دور اہتمام میں آپ ہی کے حکم سے جامعہ ڈابھیل کے طرز پر درمیانی سال کی تعطیلات رد کیے جانے کا سرکیولر جاری ہوا، بس پھر کیا تھا فلاح دارین احتجاج کی آماج گاہ بن گیا، پالنپور اور بمبئی کے طلبہ نعرے بازی پر اتر آئے، تو چھوٹے بچے بھی غول در غول جا بجا احتجاجی نعرے لگاتے نظر آتے، سنجیدہ قسم کے بڑی عمر کے طلبہ نے آنا فانا ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کی قرارداد پر عمل کرنا ہر طالب علم کے لیے لازمی قرار دیا گیا عشاء کی نماز کے بعد اور دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد مسجد میں اور چائے کے وقت مطعم میں اعلان کر دیا گیا کہ سارے طلبہ حسب معمول تعطیلات بلا اجازت کے مدرسہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھر چلے جائیں اور واپسی پر اگر کسی کو کوئی سزا دی جائے یا کسی کا اخراج ہو، تو اس

صورت میں سارے طلبہ مدرسہ خالی کردیں، لیکن اس سے پہلے صبح دس بجے تک انتظار کیا جائے، اگر مدرسہ اپنا آرڈیننس واپس لیتا ہے تو ٹھیک، ورنہ تو مدرسہ چھوڑ دیں۔ حضرت رئیس کو طلبہ کی بغاوت کی اطلاع پہنچی، عموماً فلاحی طلبہ کا مزاج باادب مطیع اور فرماں برداری کا رہا ہے، اگر آپ اکیلے مدرسہ تشریف لاتے، تب بھی کسی طالب علم کی مجال نہیں تھی کہ وہ آپ کی حکم عدولی کرتا، لیکن حکمت ودانائی جس کی چوکھٹ کی غلام ہو، اس نے ایک اور شکل اختیار کی، حضرت رئیس کے دست راست، وقار العلماء، حضرت مولانا سید ذوالفقار صاحب طاب اللہ ثراہ ایسے وقت میں سامنے آئے، حضرت رئیس کو مدرسے جانے سے روک دیا اور سبیل یہ نکالی کہ اس وقت حضرت مولانا اسماعیل دیسائی صاحبؒ اور جناب اسماعیل بھوٹیاؒ کو مدرسے بھیج دیا جائے، وہ جاکر اعلان کردیں کہ انتظامیہ آج سے تین دن کی تعطیلات پر راضی ہے، جو طالب علم ان دنوں اپنے گھر جانا چاہتا ہے، وہ درخواست کے ورقے پر مولانا کی دست خط کرالے اور جو بلا دست خط کے اگر جاتا ہے تو واپسی پر اخراج کے لیے تیار رہے مذکورہ دونوں حضرات مدرسے آئے، اس وقت ہوٹنگ کا ماحول تھا، لیکن جیسے ہی مولانا پر نظر پڑی کچھ نے احتجاج جاری رکھا اور کچھ نے فرار کی راہ لی۔ حضرت مولانا اسماعیل صاحب صوفی منش، طلبہ کے حق میں انتہائی نرم مزاج اور وسیع دل انسان تھے، طلبہ کی حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے، سیدھے کمرہ نمبر 8 کے باہر رکھی باسٹیل پر بیٹھ گئے، کچھ طلبہ درخواست لے کر آگئے، مولانا نے جلدی جلدی دست خط کرنا شروع کیے، بعض طلبہ کے اس اقدام پر علَمِ بغاوت دھڑام سے نیچے آگرا، ہنگامی حالات درستگی کو پہنچے، لیکن حضرت رئیس کی دریا دلی کا حال یہ رہا کہ نہ کسی کی جاسوسی کی، نہ کسی کی باز پرس، حالاں کہ ایسی حرکت کو برداشت کرنا حضرت رئیس کے مزاج کے خلاف تھا، لیکن کہتے ہیں: بڑا وہ نہیں ہوتا جو ہر وقت اپنے من کی

سنائے ، بلکہ بڑا وہ ہوتا ہے جو اپنے من کی بات کے ساتھ دوسروں کے من کی بھی سنے، بالآخر یہ آرڈیننس ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا اور تعطیلات بدستور جاری رہیں۔

حضرت رئیس سے متعلق انگنت واقعات ہیں، کوئی لکھے بھی تو کہاں تک؟ اب ایک ایسے واقعے پر اپنے مضمون کو ختم کروں گا، جو ہم سب کے لیے دلچسپی اور لطف کا باعث ہوگا ایک دن حضرت رئیس اپنے دفتر میں تشریف فرما تھے دفتر کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، دفتر کے پیچھے چھجے پر ایک خادم سعید نامی جاروب کشی کر رہے تھے، ان کا دماغی توازن گڑبڑایا ہوا تھا، طلبہ اور اساتذہ میں سعید بھائی پاولی کے نام سے مشہور تھے، بڑے ہی پیارے بھولے اور مزاقیہ انسان تھے۔ - اللہ پاک ان کو غریق رحمت کرے- جھاڑو لگاتے ہوئے کھڑے ہوئے اور کھڑکی سے حضرت رئیس کو جھانکنے لگے، حضرت رئیس کی نگاہ ان پر پڑی پوچھا: سعید بھائی! کیا بات ہے؟ آپ کو کچھ کہنا ہے؟ سعید بھائی نے ہاں میں گردن ہلائی، حضرت رئیس نے فرمایا: کہو جو کچھ کہنا ہے، سعید بھائی نے کہا کہ پہلے وعدہ کرو کہ غصہ نہیں کروگے، حضرت رئیس سوچ میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی بات ہوگی، جو شرطیہ کہنا چاہتے ہیں، پھر آپ نے فرمایا: سعید بھائی بلا جھجک کہو جو کہنا چاہتے ہو، سعید بھائی نے دھڑلے سے کہا: مدرسہ آپ کو کتنی تنخواہ دیتا ہے؟ حضرت رئیس یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے، کسی نے اس سے پہلے آپ سے ایسا سوال نہیں کیا تھا، کچھ دیر آپ خاموشی سے ان کو دیکھتے رہے، پھر فرمایا: کیوں؟ آپ جان کر کیا کروگے؟ سعید بھائی نے کہا: ایسے ہی بس مجھے جاننا ہے، حضرت رئیس نے مسکراتے ہوئے فرمایا: سعید بھائی پہلے آپ بتاؤ، آپ کی کیا تنخواہ ہے؟ سعید بھائی نے کہا: پانچ سو روپے، حضرت رئیس نے فرمایا: مدرسہ مجھے پانچ ہزار کی تنخواہ دیتا ہے، یہ سن کر سعید بھائی کہنے لگے: پانچ ہزار کا مطلب؟ حضرت رئیس نے جواب میں کہا: آپ کی تنخواہ سے

دس گنا زیادہ۔ یہ سن کر انہوں نے کہا: اووہو! اتنی زیادہ! پھر کہنے لگے: مولانا! ایسا کیوں؟ آپ کے دفتر کا تالا، دروازہ، کھڑکیاں ہم کھولتے ہیں، جھاڑو بھی ہم لگاتے ہیں، آپ آکر بیٹھ جاتے ہو، نہ پڑھاتے ہو، نہ کچھ کرتے ہو، جب مرضی ہو چلے جاتے ہو، پھر بھی آپ کی اتنی تنخواہ اور ایک میں ہوں کہ دونوں بورڈنگ میں جھاڑو لگاتا ہوں، پھر یہاں آکر جھاڑو لگاتا ہوں، اس کے بعد یہاں سے جا کر مطبخ میں کام کروں گا، پھر بھی میری تنخواہ اتنی کم کیوں؟ حضرت رئیس یہ سب کچھ بڑے دھیان سے سنتے رہے اور ایک نظر سے سعید بھائی کو دیکھتے رہے، اس وقت حاجی موسیٰ راوتؒ مدرسے میں تشریف فرما تھے اور یہ سعید بھائی ان کے رشتے دار تھے، حضرت رئیس نے بڑے بھولے پن سے فرمایا: سعید بھائی! اس میں میں کیا کرسکتا ہوں؟ آپ ایک کام کرو، حاجی موسیٰ سے ملو اور یہ ساری بات ان کو بتاؤ، سعید بھائی بولے: ارے مولانا! اگر میں حاجی صاحب سے یہ بات کروں گا تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گے، تو حضرت رئیس نے فرمایا: تو پھر رہنے دو، جانے دو، اس میں، میں کیا کرسکتا ہوں۔ پھر یہ بات آئی گئی ہوگئی، دو تین دن کے بعد حضرت نے سعید بھائی کو بلایا اور فرمایا سعید بھائی! آپ کو ایک کام کرنا ہے، مدرسے کے داخلی گیٹ سے سٹا ہوا ایک مکان ہے، جناب اسماعیل موٹا بھوٹیا کا، جو ایک معمر بزرگ تھے، بڑے ہی دلدار اور فلاح دارین کے ہمہ وقت کے حاضر باش، فلاح دارین میں منعقدہ کسی بھی جلسے کے جمیع شرکاء ان کے عطیے اور انعام سے کبھی محروم نہیں رہے، حضرت رئیس کے انتہائی مقرب، حضرت رئیس نے سعید بھائی سے کہا: جلدی جاؤ اور اسماعیل موٹا سے کہو: مولانا آپ کا انتظار کر رہے ہیں، وہ ان کو بلانے گئے اور خالی ہاتھ واپس آئے اور آکر کہنے لگے: موٹا گھر پر نہیں ہیں، حضرت رئیس نے فرمایا: آپ نے معلوم کیا، وہ کہاں گئے ہیں؟ کہنے لگے: نہیں، کہا: واپس جاؤ اور معلوم

کرو، کہاں گئے ہیں؟ سعید بھائی گئے اور واپس آئے اور کہنے لگے سورت گئے ہیں، حضرت رئیس نے فرمایا: آپ نے معلوم کیا: کب آنے والے ہیں؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: جاؤ اور معلوم کرو: کب آنے والے ہیں؟ یہ واپس گئے اور آ کر کہنے لگے، شام کو آئیں گے۔ حضرت رئیس نے فرمایا: آپ نے گھر والوں سے کہا کہ شام کو اسماعیل موٹا آئیں، تو ان کو مدرسہ بھیجیں، کہا: نہیں۔ فرمایا: جاؤ اور کہہ کر آؤ، وہ واپس گئے اور کہہ کر آ گئے، جب وہ واپس آئے، تو حضرت رئیس نے پہلے ان کو پانی پلایا اور فرمایا: سعید بھائی! آپ نے ایک چھوٹے سے کام کے لیے کتنا وقت گنوایا، اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو ایک ہی چکر میں سب کچھ معلوم کر لیتا، پھر فرمانے لگے: اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ مجھ کو مدرسہ زیادہ تنخواہ کیوں دیتا ہے؟ سعید بھائی ہنستے ہوئے کہنے لگے: یہ سب دماغ کی بات ہے اور میرے پاس دماغ نہیں ہے، یہ سن کر حضرت رئیس مسکرانے لگے اور فرمانے لگے: سعید بھائی! ایسا ہی ہے۔ محترم قارئین یہ تھا ہمارے حضرت رئیس کا اندازِ حکیمانہ۔

جہاں تک حضرت رئیس کو ہم نے دیکھا ہے، جانا ہے یا ان کے بارے میں پڑھا ہے، اس کے مقابل مہتمم یا رئیس ایک معمولی سا خطاب یا چھوٹا سا عہدہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت رئیس ایک آفاقی شخصیت تھے، آپ کا مقام اور مرتبہ ان بزرگوں اور اسلاف کے ہم پلہ ہے، جن کا نام آتے ہی عقیدت و محبت سے ہماری گردنیں خم ہو جاتی ہیں۔ اتنے بڑے مقام و مرتبے پر فائز ہونے کے با وجود اللہ پاک کے اس مخلص، باصفا، باوفا، باکمال، بے غرض و بے نفس، مقبول و معروف بندے نے نہ کسی مجلس و محفل میں، نہ کسی سیمینار و کانفرنس میں، نہ کسی جلسے و جلوس میں اپنی حذاقت و لیاقت کا اظہار کیا، نہ اپنے مجاہدات و کمالات کا افشاء، جب بھی کچھ کہا، بولا یا بیان کیا، ہمیشہ اپنے بڑوں کا کہا، بولا اور بیان کیا

اور ہمیشہ اس شعر کا مصداق بنا، جس کو وہ ہمیشہ گنگنا تا رہا:

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں ملکر گل گلزار ہوتا ہے

بالآخر زمانے نے دیکھا، جانا اور مانا کہ دارالعلوم فلاح دارین کے مہتمم اور اس کے رئیس ہمارے استاذ، مربی محسن اور ہماری علمی چراہ گاہ کے چارا گر ہمارے علمی گلستاں کے باغباں، ہمارے مقتدا اور پیشوا، فخر ملت و مفکر امت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت فیوضھم ورحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعہ وطاب اللہ ثراہ نامی شخصیت ایک چھوٹی سی نامعروف بستی سے نکلی اور اس نے آفاق کی وسعتوں کو چھولیا، اور چہار دانگ عالم میں چھا گئی، ہم ہمارے اللہ کے حضور دست بدعا ہیں کہ اللہ پاک آپ کے اہل خانہ، متعلقین، منتسبین، محبین اور ہماری پوری فلاحی برادری کو آپ کے فیوض و برکات سے ہمیشہ بہرہ مند رکھے۔

حضرت قاری انیس مرحوم عارف باللہ، عاشق رسول ذاکر وشاکر، دنیا کی دل فریبی اور مکاری سے خالی، تکلف سے عاری، متوکل علی اللہ، سیدھی سادی اور بھولی بھالی شخصیت تھے، گوشت سے پر، قدرے گول خوب صورت نورانی چہرہ، نرم و نازک بدن، گھٹنوں تک کا پاجامہ، بدن پر جبہ نما کرتا، نگاہ جھکی ہوئی، مور و مار بھی نہ بدکے ایسی دھیمی، مگر تیز چال، نہ اپنے آگے نہ اپنے پیچھے کسی کا چلنا پسند، یکسو، خاموش طبع، اس سادگی پر کون نہ مرجائے! اے خدا کے مصداق انسان۔ یہ تھے ہمارے استاذ مکرم حضرت قاری انیس احمد مرحوم -طاب اللہ ثراہ-

عربی سوم میں ہماری جماعت ان کے یہاں منتقل ہوئی، خلاصہ اور جزری پڑھاتے

مطلب کی بات بیان فرماتے ،طلبہ سے قراءت ترتیلاً اور تدویراً سنتے اور صحت ادائیگی کے بعد قرآن کریم از اول تا آخر حدراً خود تلاوت فرماتے ،طلبہ کی غلطی پر ہلکی اور پتلی سی چھڑی سے مسکراہٹ کے ساتھ ہلکی سی پٹائی کرتے ، ہمارے ایک ساتھی تھے: مولوی عثمان کٹھور، انتہائی شاطر اور مسخرہ باز، مگر اپنے آپ پر پورا کنٹرول، ترتیل کی باری آنے پر جیسے ہی قاری صاحب اشارہ فرماتے ابھی استعاذہ اور بسملہ بھی ختم نہ ہوتی اور یہ ایسی حرکت کرتے کے ہنسی نکل آتی ، وہ جو کہاوت مشہور ہے : بدا چھا، بدنام برا کے تحت قاری صاحب روک دیتے ، ویسے لہجہ بھی ایسا پایا تھا کہ جیسے ہی پڑھنا شروع کرتا ،خود قاری صاحب کو ہنسی آجاتی ، اپنی بلا آپ ،کبھی ترتیلاً نہ پڑھ پایا، جب ششماہی امتحان ہوا تو جزری کا پرچہ قاری صدیق صاحب کے یہاں تھا اور خلاصہ کا پرچہ حضرت مولانا یوسف صاحب کے یہاں ، دونوں کتابیں برابر یاد تھیں ،نمبرات ملے 48،48۔

اور ایک میرے ساتھی تھے: مولوی حنیف رویدروی، حال مقیم یوکے۔کافی ذہین اور بہترین حافظہ کے مالک ، اساتذہ کے منظور نظر ،لیکن خلاصہ میں گچہ کھا گئے اور ان کو کم نمبرات ملے ،تعطیلات کے بعد قاری صاحب کی واپسی ہوئی ،آفس سے امتحان کی کاپیاں منگوائی ،نمبرات دیکھے ،ہم دونوں کو قریب بلایا ،حنیف سے فرمایا: آپ کے اتنے کم نمبرات کیسے؟ اور مجھ سے فرمایا: اتنے زیادہ نمبرات کیسے؟ میں نے جی میں کہا: مر گئے۔حنیف کہنے لگے: ایوب تو گیا، میرا کام بن گیا، اشارہ اس طرف تھا کہ اب سالانہ میں الٹا ہوگا اور آخر ہوا بھی یہی ، سالانہ میں قاری صاحب کے یہاں پرچہ تھا ، مجھے نمبرات ملے 27 اور حنیف کو

48۔ترتیل، تدویر، حدر اور جزری سب میں 40 سے زیادہ نمبرات تھے،لیکن خلاصہ میں ناکامی، حالاں کہ کتاب اچھے سے یاد تھی ،لکھا بھی برابر تھا، پر قاری صاحب تو قاری صاحب تھے، وہ تو چاہ اور طلب کو دیکھتے تھے، آپ نے اس میں ہم کو کم پایا تو ناکام کر دیا۔

چہارم میں پھر میں نے شکایت کی کہ قاری صاحب آپ نے ہم کو ناکام کر دیا، فرمایا: آپ اسی داؤ کے ہو، خیر! پھر دورے میں امتحان دیا اور 48 نمبر ملے، لیکن اس وقت قاری صاحب نہیں تھے، یہ قاری صاحب کی عقیدت وعظمت تھی کہ پھر بھی رتی بھر برا نہیں لگا، بس مسکراتے رہے اور قاری صاحب سے محبت بڑھتی چلی گئی۔

حضرت قاری صدیق صاحب تعلیمی مرحلے کے دوران ہی مسند نشیں آرائے تجوید ہوئے، ان کا جڑاؤ درس گاہ اور دارالاقامہ سے برقرار تھا، بہت سے طلبہ سے ان کی رفاقت تھی ،طلبہ کی طبائع اونفسیات سے واقف تھے، ان کی درس گاہ اور دارالاقامہ والی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی ، وہ ان کی خوبیوں اور کمیوں کے جان کار تھے، دوران تدریس اپنی ذکاوت و ذہانت کو کام میں لاتے ہوئے طلبہ کی خوبیوں کو پروان چڑھایا اور کمیوں کو دور کرنے کی سعی مشکور کی، آپ کی اس خوبی اور کمال نے جہاں آپ کو طلبہ میں مقبولیت دلائی وہیں ان پر آپ کے رعب وداب کا سکہ بھی چلنے لگا، طلبہ کے لیے آپ کی محبت اور رعب و داب نے یہ تاثیر قائم کی کہ اردو سے لے کر دورے تک کے طلبہ آپ کے ایک حکم پر سب کچھ کرنے کو تیار نظر آنے لگے، ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کرم فرما حضرت رئیس مرحوم کے زیر قیادت شعبۂ تجوید میں بدلاؤ کی وہ بیار بہادی کہ فن تجوید فلاح دارین کا

جزو لاینفک بن گیا،شعبۂ تجوید کی انجمن لجنۃ القراءت والتجوید کی نگرانی اور چلانے کی ذمہ داری عربی سوم کے طلبہ پر عائد تھی، صدر اور نائب صدر کے لیے چناؤ ہوتا، جس کو زیادہ ووٹ ملتے وہ صدر اور نائب صدر کے لیے نامزد ہوتا۔

ہماری جماعت جب عربی سوم میں آئی، تو مولوی عبدالرحیم پالیجوی صدر اور بندہ نائب صدر کے طور پر نامزد ہوئے، انجمن کے لیے بدھ کی رات عشاء بعد کا وقت طے تھا اس کے لیے مختلف شعبے تجویز کیے جاتے، ہر شعبے میں 10 سے 15 طلبہ ہوتے، اردو سے عربی سوم تک کے تمام طلبہ کی شرکت ہوتی، ہر شعبہ کی صدارت کے لیے عربی سوم کے طلبہ کا تعین صدر انجمن کے زمہ ہوتا، باقی طلبہ درس گاہ میں نگرانی پر مامور ہوتے، جو ہر شعبہ کا چکر لگاتے۔انجمن کیا تھی؟ چاہے وہ لجنۃ ہو یا اصلاح الکلام، اس کے مفید تر ہونے کے اقرار کے ساتھ بس وہ ریاست ہوتی، اصلاح الکلام میں دورہ کے طلبہ کی حکومت ہوتی اور لجنۃ میں عربی سوم کے طلبہ کی، اس میں حضرت قاری صاحب نے سب سے پہلا بدلاؤ یہ کیا کے نگرانی کے لیے بذات خود تشریف لاتے، طلبہ کا چکر لگانا بند کر دیا گیا، چکر لگانے کی اجازت صرف صدر اور نائب صدر کو ہوتی، سختی کے ساتھ ہر ایک کو اپنی باری پر صحت کی تیاری کے ساتھ تلاوت پھر چاہے وہ ترتیلا ہو یا تدویراً و حدراً کرنی ضروری قرار دیا گیا۔ پِن ڈروپ سائلنس کے ماحول میں انجمن اپنے اختتام کو پہونچتی، نتیجۃً لجنۃ اپنے محدود فائدے کے بجائے مفید تر فائدے کی ضامن بن گئی، شعبۂ تجوید میں دوسرا بدلاؤ یہ ہوا۔

حضرت الاستاذ قاری انیس احمد صاحب نے فلاح دارین کے شعبۂ تجوید کو تجویدی

فن کے کمال کے ذریعے افراد سازی کی وہ سوغات دی، جس نے علم تجوید کے ذریعے خواص تو خواص عوام تک میں قرآن کریم کی صحیح تلاوت کی روح پھونک دی، اس سے پہلے حالت یہ تھی کے بہترین تلاوت کا معیار صوتی حسن تھا، تصحیح حروف کو لے کر بیداری کا لعدم تھی اور آج حالت یہ ہے کہ لحن خفی بھی اجاگر ہو کر سامنے آجاتی ہے، پہلے جہاں قراءت حفص کے لیے قراء کا فقدان نظر آتا تھا، آج حالت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان قراءت سبعہ عشرہ سے ناواقفیت کا اقراری ہوگا، اس کے پیچھے سب سے بڑا عامل کارفرما تھا حضرت رئیس مرحوم کا، وہ جذبۂ ایمانی تھا جو بڑے تو بڑے چھوٹے بچوں تک سے صحیح تلاوت کلام پاک کے خواستگار تھے، اس کے لیے سب سے پہلے ایسے لائق وفائق اور کامل واکمل افراد کو تیار کرنا جو صحیح جذبۂ دینی کے ساتھ مشن کے طور پر اس کے افشاء وتبلیغ میں اپنے آپ کو کھپا دیں یہ حضرت رئیس ہی کی دوراندیشی تھی کہ آپ نے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا، جو ہر طرح کی دنیوی الجھنوں سے آزاد ہو اور ان کے ساتھ ایسے سلیم الطبع طلبہ کو جوڑا جن میں آپس میں استاذ وشاگردیت کا رشتہ ہی نہ ہو؛ بلکہ فدائیت کا رشتہ ہو، حضرت قاری انیس مرحوم پر نہ وقت کی پابندی تھی نہ نصاب کی حد بندی، اور نہ ہر کس وناکس کو پڑھانے کی ذمہ داری، بس وہ تھے اور چاہ وطلب والے طلبہ اور آپ کے اس مزاج ومذاق نے دیگر افراد کے ساتھ ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا جس نے حضرت رئیس مرحوم کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیا وہ شخصیت تھی جس کو ہم اور آپ حضرت قاری محمد صدیق صاحب سانسرودی فلاحی کے نام سے جانتے ہیں۔

ویسے ہمارے گجرات میں قائم ہر ادارے میں شعبۂ تجوید کا وجود قائم تھا، لیکن اس کے عروج وترقی میں فلاح دارین کے مثالی کردار کو تاریخ ہمیشہ سر آنکوں رکھے گی۔ حضرت قاری صدیق صاحب کے مسند نشیں سے پہلے بھی قراءت حفص کا شعبہ اپنی جولانیاں دکھا رہا تھا، لیکن حضرت قاری انیس صاحبؒ کے فنی کمال اور ان کی صحتِ ادائیگی کی ضد نے جو نفاست ونزاکت کی چاشنی سے شرابور کیا اور اپنے تلامذہ کو اس شیرینی کا جو چسکہ لگایا، اس کا سہرا تو صرف ان ہی کے سر سجے گا، لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سہرے کا مرکزی آب گینہ حضرت قاری صدیق صاحب کی ذات ہے اور یہ بھی قبول کرنا ہوگا کہ اس سہرے کی سجاوٹ کرنے والی اور قاری صاحب کا سر سجانے والی اگر کوئی شخصیت تھی تو فلاحی خلوص وصفا کی مورت حضرت رئیس مرحوم کی ذات تھی۔

شعبۂ تجوید میں دوسرا بدلاؤ یہ ہوا کہ اردو سے لے کر عربی سوم تک کے طلبہ کے لیے عشاء کی نماز کے بعد متصلاً آدھا گھنٹہ مشق کے لیے لازمی قرار دیا گیا، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طلبہ میں تصحیح حروف اور اس کی صفات وقواعد کو لے کر ذوق وشوق پنپنے لگا اور تجوید کے لیے ماحول سازگار بننے لگا، دوسری طرف جو طلبہ اچھا پڑھنے والے سنجیدہ اور محنتی ہوتے قاری صدیق صاحب اپنے خرچے سے ان کے لیے انڈے اور دودھ کا نظم فرماتے اور اسی پر بس نہ فرماتے، اگر کوئی ایسی بیماری کا شکار ہوتا جس سے پڑھنے میں دقت ہوتی، تو علاج اور اگر آپریشن وغیرہ کی ضرورت ہوتی، تو سارہ خرچہ خود اٹھاتے۔ قصہ مختصر! اچھے پڑھنے والے محنتی اور ذوقی طلبہ کے ماں باپ کا کردار بھی آپ ہی نبھاتے، اصلاح قراءت

اورفن تجوید کا فروغ آپ کی زندگی کا مشن بن گیا تھا،جس نے بہت جلداس شعبہ کولابدی اور اہمیت کا حامل بنا دیا،صرف گجرات ہی نہیں؛ ملک اور بیرون ملک میں اس کے چرچے ہونے لگے،حضرت رئیس کی یہ عادت رہی تھی کے جب بھی فلاح دارین میں کسی مہمان کی یااہم شخصیات کی آمد ہوتی،طلبہ کو بلاتے اورقرآن پاک سنواتے۔

مجھے یاد ہےایک مرتبہ عرب سے شیخ مجذوب تشریف لائے ہوئے تھے، ان کو مدرسے کی زیارت کرارہے تھے سامنے سے درجۂ حفظ کا ایک چھوٹا سا بچہ آرہا تھا جو بڑا ذہین تھا،قرآن اچھی طرح یادتھا،صحت اورلہجہ بھی اچھا تھا،آپ نے اس کوراستے ہی میں کھڑا کرلیااور شیخ مجذوب سے اس کے متعلق گفتگو کی،اس کے بعد شیخ نے کھڑے کھڑے ہی اس سے دوتین مقامات سے زبانی قرآن سنا،اس کی صحت اورحفظ سے اتنےخوش ہوئے کہ اس کواپنے سینے سے چمٹالیا،اس کی پیشانی کا بوسہ لیا، جب شیخ یہاں سے عرب واپس ہوئے ،تواپنے سفرہند کی روداد میں ایک کتاب لکھی،جس میں فلاح دارین،حضرت رئیس اورخاص کراس بچے کا ذکرکیا، وہ بچہ تھا میرا دوست اور ساتھی: مولوی محمد حنیف رویدروی حال مقیم یوکے۔حضرت رئیس طلبہ کے سامنے بڑے تپاک سے اس واقعہ کا تذکرہ فرماتے۔

فلاح دارین کی شروعات بَنا محلے میں واقع ایک مکان میں ہوئی، جو بعد میں حضرت رئیس کا مسکن رہا،بعد میں جب مدرسہ اوردارالاقامہ بن کرتیار ہوگیا جوفی الحال ہے، تویہاں منتقلی عمل میں آئی۔پھر جیسے جیسے طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی، نئے نئے درجات وقوع پذیر

ہوتے گئے،مختلف علوم وفنون کے لیے لائق اساتذہ کی ضرورت پیش آتی گئی۔حضرت رئیس مرحوم کا یہ امتیازی وصف رہا کہ آپ نے اپنی دینی بصیرت اور سلامتی فکر کے مدنظر ایسی شخصیات کا انتخاب کیا کہ ان سے بہتر کا تصور نہیں کیا جاسکتا،آپ کے انتخاب کا معیار خدمت دین کا جذبہ،معیاری صلاحیت،علم وفن سے مکمل آگہی،کتب بینی کا ذوق،صلاح وتقوی، بزرگان دین سے وابستگی اور سادگی بھری زندگی تھا۔اس معیار پر جو کھرا اترتا حضرت رئیس کی پسند بن جاتا۔

آپ کے اہتمام کا دوسرا امتیازی وصف یہ رہا کہ آپ نے طلبہ اور اساتذہ میں ایسا جوڑ اور مناسبت کا رشتہ قائم کیا کہ ہر دو یک جان دو قالب نظر آنے لگے اور اس پر مستزاد آپ کے ذاتی اوصافِ حمیدہ،کریمانہ اخلاق، وسیع ظرفی، درگذر اور چشم پوشی کی مستانہ ادا،خوش طبعی،زندہ دلی اور بارعب شخصیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

یہ بھی آپ کی سب سے بڑی خوبی رہی کی طلبہ کے سامنے ہمیشہ اپنے مدرسین کی خوبیوں کو اجاگر کرتے،ان کی قدر ومنزلت کا اعتراف کرتے،ان کے علمی مقام کو سراہتے اور ان سے وابستگی کے فوائد بیان فرماتے،تو دوسری طرف طلبہ کی محنت،لگن،ذکاوت وذہانت کا مدرسین کے سامنے تذکرہ فرماتے،کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی مدرس ناراض ہوکر کسی طالب علم کو درس گاہ سے باہر کردیتے،تو کبھی ان کو قصوروار نہ ٹھہراتے اور ان پر کبھی یہ دباؤ نہ ڈالتے، بلکہ طالب علم کو مجبور کرتے کہ وہ اپنے استاذ سے معافی مانگ کر ان کی رضامندی حاصل کرے، اگر طلبہ کسی استاذ کی کتاب سے متشرح نہ ہوتے،تو اس کا بھی مناسب ڈھنگ سے تدارک

فرماتے، خارج اوقات میں اکثر عصر کے بعد یا انجمن کے جلسوں میں طلبہ کے سامنے اسلاف کی زندگیاں، حصول علم کے لیے ان کی محنت ومجاہدات اور اور ان کے دینی کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے طلبہ کو راتوں کو جاگنے اور محنت کرنے پر ابھارتے، اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے سامنے پوری قوت سے یہ بات بھی واضح کرتے کہ اگر کوئی طالب علم کسی سبق کو نہ سمجھ پایا ہو، تو یہ استاذ کا فرض ہے کہ اس کو دوبارہ، سہ بارہ سبق سمجھائیں، اور طلبہ سے بھی فرماتے کہ چاہے دن کا وقت ہو یا رات کا، اگر سبق سمجھ میں نہیں آیا تو استاذ سے دوبارہ سبق سمجھانے کی درخواست کرنے کو فرماتے۔ حضرت رئیس کی اس دل سوزی اور تڑپ نے فلاح دارین میں تعلیم کے لیے ایسا ماحول تیار کر دیا کہ طلبہ بلا کسی نگرانی کے خارج وقت میں چاہے وہ دوپہر کا وقت ہو یا رات کا، دیر گئے تک مطالعہ وتکرار میں مصروف نظر آتے، یہاں تک کہ جو طلبہ تکرار چی ہوتے وہ عصر کے بعد بھی مطالعہ میں مشغول نظر آتے۔ حضرت رئیس کی ان ہی خوبیوں نے بہت جلد فلاح دارین کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔

ویسے فلاح دارین کا شروع سے یہ امتیاز رہا ہے کہ اس کے اساتذہ اور طلبہ میں رشتہ کافی پائدار ہوتا ہے اور مدرسہ کے خارج اوقات میں تو اس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اس لیے اکثر دیکھا گیا کہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد عصر کے بعد مختلف اساتذہ کے گھر مجالس میں جاتی دکھائی دیتی ہے اور یہ مجالس آپسی رشتہ کی ہمواری میں بڑا رول ادا کرتی ہیں، اور جو کچھ کمی رہ جاتی ہے، دورہ کا سال اس کی بھرپائی کر دیتا ہے اصل میں یہ کمال تھا حضرت رئیس کے اس مدبرانہ اہتمام کا، جس میں وہ اپنے ہر مدرس چاہے وہ چھوٹے درجے کا ہو یا بڑے

درجے کا، ان کی صلاحیت، قابلیت، محنت اور اخلاص وللّٰہیت کو اس انداز سے آشکارا کرتے کہ طلبہ اساتذہ کی اور کھنچے چلے جاتے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فلاح دارین کے اساتذہ بے نفس اور بے غرض ہو کر اپنی پوری توجہ، انہماک اور محبت طلبہ پر لٹائے چلے جاتے، آخر بھلا وہ منظر کیسے بھلایا جاسکتا ہے کہ دورہ میں جب مولانا شیر علی صاحبؒ ترمذی شریف کے ختم پر کتاب بند کرتے ہوئے ھذا فراق بینی وبینکم کا جملہ ارشاد فرماتے، تو طلبہ کی چیخیں نکل جاتیں اور ان سے لپٹ کر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ پڑتیں، یہی حال ہر استاذ کے یہاں کتاب کے ختم پر ہوتا۔

خیر حضرت قاری انیس صاحب کا ایک واقعہ لکھتا چلوں، جس میں استاذ وشاگرد کی بے لوث محبت کی جھلک دکھائی دے گی۔ افریقہ کے ایک طالب علم جن کا نام یاد نہیں آرہا حضرت قاری صاحب کے یہاں درمیانی سال میں تجوید میں تخصص مکمل کیا، دوسرے دن دوپہر میں ان کی وطن واپسی تھی، ہمارا چہارم یا پنجم کا سال تھا، قاری صاحب کے یہاں ہماری تیسری گھنٹی تھی، اس میں وہ وداعی ملاقات کے لیے سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے، قاری صاحب شال لپیٹے ہوئے سبق پڑھا رہے تھے، سبق بند کر دیا وہ آئے اور سر جھکا کر دو زانو بیٹھ گئے، ادھر قاری صاحب بھی سر جھکائے بیٹھے رہے، بڑا عجیب منظر ایک شاگرد اپنی آخری ملاقات میں استاذ کے سامنے جدائی کے غم میں زار وقطار رو رہا ہے، روتے روتے ہچکی بندھ جاتی ہے حضرت قاری صاحب ڈبڈبائی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کی اور پانی بھرا گلاس بڑھاتے ہیں، ایک دو گھونٹ پی کر ادب سے گلاس رکھ دیتے ہیں، پھر نصیحت

کا دور شروع ہوتا ہے، اپنے استاذ حضرت قاری ثابت اور قاری عبدالرحمن پانی پتی کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے، پھر رونا شروع ہوتا ہے قاری صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتے ہیں اور دونوں معانقہ کرتے ہوئے آنسو بہاتے ہیں، معانقے کے بعد جیسے ہی جانے کے لیے پلٹتے ہیں، قاری صاحب وداع کرنے کے لیے دروازے تک جاتے ہیں، جانے والا جھک کر آخری بار اپنے استاذ کی چپلیں سیدھی کرتا ہے اور رخصت ہوتا ہے یہ منظر بڑا دیدنی ہوتا ہے، ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس رشتہ کو سوائے فدائیت کے اور کیا کہہ سکتے ہیں!! بس اسی رشتے اور جذبے سے قاری صاحب اپنے شاگردوں کو جوڑتے تھے، اس روایت کو زندہ رکھنے والی شخصیت آج بھی فلاح دارین میں موجود ہے جس کو ہم حضرت قاری محمد صدیق صاحب کے نام سے جانتے ہیں۔

انزل القرآن علی سبعة أحرف والی روایت جیسے ہی نظر سے گزرتی اور کانوں سے ٹکراتی ہے قرآن کریم کی تلاوت ایک نئے انداز اور نئے طریقے کے ساتھ ادائیگی اور لہجے کے بدلاؤ کے سبب قلب وقالب میں ایک نشاط سا پیدا کر دیتی ہے، یہ تلاوت تجوید کی دنیا میں قراءت سبعہ عشرہ کے نام سے جانی جاتی ہے، اس کی تائید میں احادیث کی بہتات ہے، جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کی حکمتوں کی بھی بھرمار ہے اس میں سے ایک ایک کو تحریر کی زد میں لاتا چلوں:

ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے جس کو شیخین نے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جبرئیل نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا تو

میں نے ان سے مراجعت کی اور میں حروف میں زیادتی طلب کرتا رہا اور وہ حروف میں اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہونچ گئے۔

امام مسلمؒ نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں.....

ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ یہ سات حروف ایک ہی امر میں ہیں جو کہ حلال وحرام میں مختلف نہیں۔ اور سات حروف میں نزول کی حکمتوں میں سے ایک حکمت امت اسلامیہ کا ایک ایسی زبان پر جمع کرنا تھا، جو ان کے درمیان اتحاد پیدا کرے اور یہ قریش ہی کی وہ زبان تھی کہ جو موسم حج وغیرہ میں مکہ میں آنے جانے والے قبائل عرب کی بہت ساری چیدہ چیدہ زبانوں کو شامل تھی اسی وجہ سے قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا تا کہ ہم قبائل عرب کی ان لغات میں سے جس کو چاہیں اپنے پڑھنے کے لیے منتخب کرلیں جن کا نمونہ قریش کی زبان میں پایا جاتا ہے یہ ایک عالی شان حکمت الٰہیہ ہے کیوں کہ ایک جنرل زبان کی وحدت امت کی وحدت کے اہم عوامل میں سی ایک عامل ہے۔